188742

٨٩١٥
ع

UNIVERSAL LIBRARY
OU_188742
UNIVERSAL LIBRARY

غنچۂ تبسم

نگارش

تمکین کاظمی

طبع اوّل ۔ ایک ہزار

قیمت عما دو روپیہ

ملنے کے پتے

۱ مکتبۂ ابراہیمیہ (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔
۲ مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ ۔ قرول باغ،
۳ مہتمم رسالہ "ساقی" کھاری باؤلی،
۴ حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لیمیٹڈ،
(دھلی)
۵ صدیق بک ڈپو،
۶ نسیم بک ڈپو،
(لکھنؤ)
۷ کتابستان، ۱۷، سٹیلی روڈ، الہ آباد،
۸ اردو بک ڈپو، بچھراؤں (مراد آباد) یوپی،
۹ حالی بک ڈپو، پانی پت،
۱۰ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور،

مولانا تجلی مرحوم

ولادت
ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۲ ہجری - حیدرآباد دکن

وفات
۱۷ صفر سنہ ۱۳۴۶ ہجری - گلبرگہ شریف

بروحِ پاکِ والدِ مرحوم

مولٰنا تجلّی

تقدیم گردید

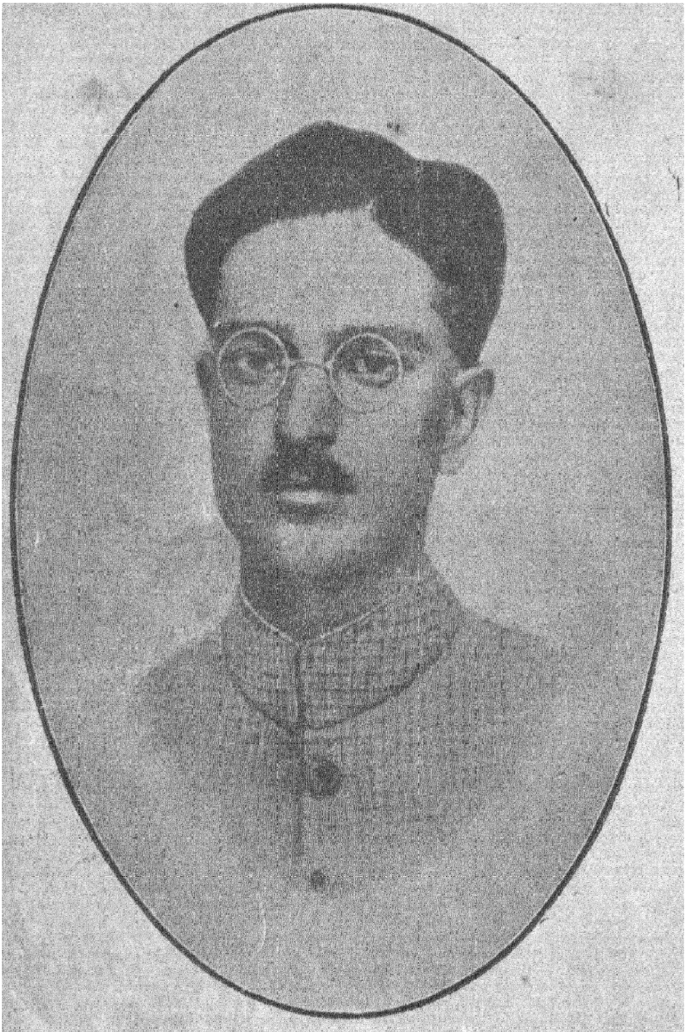

سید تمکین کاظمی

سرِ آغاز

بنام خداوند بخشائش گر مہرباں

ذکاہات اور ہزلیات میرے موضوع سے بہت دور تھے کیونکہ میں اثری تاریخی اور علمی مضامین پر زیادہ وقت صرف کیا کرتا تھا۔ ابتداءً میں نے تفریحی طور پر اس قسم کے مضامین لکھنا شروع کیا چنانچہ "زن مرید" اسی سلسلہ کی پہلی قسط ہے جس کی اشاعت رسالہ نظر لکھنؤ جولائی ۱۹۲۶ء میں ہوئی مگر چند ہی مضامین لکھ کر میں نے اسے ختم کر دیا چنانچہ ۱۹۲۹ء میں سوائے ایک "گھبراہٹ" کے اور کوئی مضمون نہیں لکھا۔ مگر ۱۹۳۰ء اور اوائل ۱۹۳۱ء میں مجھے مصروف زیادہ رہنا پڑا اور مدیران رسائل نے مضامین کیلئے مارے تقاضوں کے ناک میں دم کر دیا ہر ایک رسالہ کے لئے علمی، ادبی، یا تحقیقی مضمون لکھنے کا وقت کہاں سے لاتا بعضوں کے لیے کچھ وقت نکال لیا اور بعضوں کو انہیں "بدحواسیوں" پر ٹرخا دیا۔ یہ ہے شانِ نزول ان مضامین کی جو کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہیں، ان میں سے اکثر مضامین میرے نام سے شائع ہوئے ہیں اور بعض فرضی ناموں "نجاری" "آوارہ" "فلک نما" وغیرہ کے ساتھ چھپے ہیں۔

بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہوگا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خوش نصیبی سے مجھے دکنی ہونے کا فخر ہے اسی لئے میں دکنی اردو لکھتا ہوں

ترا ملک دکھن تو دکھنیچ[1] بول
تجھے کیا پرائی تو اپنیچ[2] بول

میری مادری زبان اردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے مگر میں اس قدر مجبور ہونا پسند نہیں کرتا کہ "اماحوا" کی بجائے "ماماحوا" "گنڈیوں" کے عوض "گھنڈیاں" "چھاتی" کی بجائے "سینہ" "گرد ڈاڑھی" کے بدلے "گردے کی ڈاڑھی" اور "چکنے ہوئے گال" کو "پچکے ہوئے گال" کہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ برادرانِ ہند گرد ڈاڑھی پڑھ کر گردے کی ڈاڑھی کا تصور کرنے میں تامل کریں گے اور "چھاتی" سے "سینہ" مراد نہ لیں گے مگر میں نے جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال کیا ہے تاکہ وہ دکنی الفاظ جو آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں کم از کم میرے مضامین میں محفوظ رہ جائیں اور برادرانِ ہند بھی اِن دکنی الفاظ سے واقف ہو جائیں۔

علاوہ ازیں بعض دکنی مصطلحات "لنگر" "جھمکڑے" "تقصیر" "تنبی" وغیرہ بھی ان مضامین میں جابجا آگئے ہیں جو برادرانِ ہند کے لئے کیسر نئے ہیں بعض احباب کا

---

[1] دکھنی ہی ۱۲ [2] اپنی ہی ۱۲

خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگائی جائے مگر میں اس بدذوقی کا مخالف ہوں جنھیں ضرورت ہوگی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لینگے یا مجھ سے دریافت کرلینگے۔

ان دکنی الفاظ اور اصطلحات کے بجائے میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کرسکتا تھا مگر جس طرح حضرت نیاز فتحپوری نے تحریر فرمایا ہے کہ ان کی سماعت سوا ان محاورات یا اصطلاحات کے جو گہوارے سے ان کے کانوں میں پڑے ہیں مخالف آواز سن کر مشوش ہوتی ہے۔ اسی طرح میری زبان بھی ان محاورات اور اصطلاحات کو ادا کرتے ہوئے مشوش ہوجاتی ہے جو گہوارے سے میرے کانوں میں نہیں پڑے

چونکہ دلی والے اپنے محاورات اور اصطلاحات بے تحاشا استعمال کئے جاتے ہیں اور لکھنؤ والے ان پر معترض نہیں ہوتے اور لکھنؤ والے بے دھڑک اپنی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا نہیں اسی طرح حیدرآباد والوں کو بھی اپنے حال پر چھوڑدینا چاہئے نہ تو دلی والوں کو اس پر اعتراض کا حق ہے اور نہ لکھنؤ والوں کو۔ اس مجموعہ میں کتابت اور طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں، جب تک ہندوستان میں لیتھو پریس رہیگا اس وقت تک یہ غلطیاں مستقل طور پر موجود رہینگی ایک میں ہی کیا سارا ہندوستان ان چھاپے کے پتھروں سے "دِق" ہے

تاہم "شمس الاسلام پریس" کے کارپردازوں کا مشکور ہوں کہ حتی الامکان روا داری اور تن دہی سے طباعت کا کام ختم کیا گیا مگر مجھے کتابت کے لئے سخت کوفت اٹھانی پڑی کیونکہ بدنصیبی سے عبدالکریم جیسے کاتب کا ہاتھ جو زود نویس اور حیدرآباد کے اچھے کاتبوں میں

شمار ہوتے ہیں مگر حد درجہ غلط نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملوں کے جملے چھوڑ دئیے اور مجھے جا بجا انہیں غلط اسلط الفاظ کو الٹ پلٹ کر چھپوانا پڑا۔

"اعلام" "تاثر" "تعارف" اور "تقریب" کے لئے مکرمی مولٰنا نیاز فتحپوری مدیر رسالہ "نگار" لکھنؤ" محترمی مولٰنا احسن مارہروی لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ محبی حضرت ملّا رموزی (بھوپال) اور عزیزی مولوی عبدالمنعم سعیدی (گلبرگہ) کا رہین منت ہوں کہ باوجود اپنی مصروفیتوں کے ان حضرات نے "غنچۂ تبسم" کے لئے کچھ نہ کچھ لکھا۔ "صحت نامہ" کی ترتیب کے لئے محترمی مولوی محمد سردار علی صاحب مدیر رسالہ "تجلی" کا مشکور ہوں کہ آپ نے صحت نامہ مرتب فرما دیا اگر ان غلطیوں کے علاوہ اور کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو اسے مولوی صاحب کی بشریت پر محمول فرمائے۔

والد مرحوم کی اور اپنی تصویر کے بلاک کے لئے برادر مکرم مولوی شاہد احمد بی اے (آنرز) مدیر رسالہ "ساقی" دہلی کا منت پذیر ہوں کہ موصوف نے خاص طور پر دونوں بلاک بنوا کر روانہ فرمائے۔

مشفقی مولوی عبدالحق صاحب مہتمم مکتبۂ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن کا شکریہ ادا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ انہیں کی وجہ اس مجموعے کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے ہی مجبور کر کے اس کی طباعت کے لئے آمادہ کیا فقط

تمکین کاظمی

ملک پیٹھ۔ حیدرآباد دکن
۱۔ جون ۱۹۳۱ء

اعلان

از

مولانا نیاز فتحپوری مدیر رسالہ نگار (لکھنؤ)

غنچۂ تبسم جناب تمکین کاظمی کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو "فکاہات" کے سلسلہ میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں "طنزیات" اور "مزاحیات" دونوں کو "فکاہات" میں شامل کرتا ہوں، اسلئے میرا مقصود یہ ہے کہ دو رنگ کے مضامین اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔

اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں ہے جس میں یہ مخصوص طرزِ تحریر مقبول نہ ہو۔ خصوصیت کے ساتھ تنقید کہ اسکی تو تکمیل ہی نہیں ہوسکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔ ہندوستان میں اس انداز کے لکھنے والے چند ہیں۔ جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ اکتشاف ابھی ہوا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

اس مجموعہ کے تمام مضامین صحیح معنی میں "تنقید و نگاہی" کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ وہ یکسر مقامی حالات مقامی تشخصات یا حیدآباد کی اصطلاح میں "ملکی" افراد و مناظر سے متعلق ہیں اس لئے انکا پورا لطف اٹھانا کسی غیر شخص کیلئے دشوار ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر اس خصوصیت سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی انکو دیکھا جائے تو ان کے پڑھنے اور ختم کرنے پر بڑی حد تک انسان مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہ واقعات و تلمیحات سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا کہ موجودہ حیدرآباد "دورِ نہضت و ارتقاء" سے گذر رہا ہے یا "دورِ انحطاط" سے لیکن ان مضامین کے دیکھنے کے بعد میں یہ ضرور کہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور کسی ایسے زمانہ سے گزر رہا ہے جو پہلے سے مختلف اور بہت مختلف ہے۔ جناب تمکین کاظمی کے اکثر مضامین اسی حقیقت کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ نتیجہ کے لحاظ سے وہ حیدرآباد حالیہ کو ترجیح دیتے ہیں یا دور ماضی کے سوگواروں میں ہیں وگاہی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔

زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ

یہ اختلاف شمال وجنوب کا اختلاف ہی جس کا دور ہونا ممکن نہیں اور نہ اس پر زیادہ اعتناء کی ضرورت ہے۔ اکبر مرحوم کی ایک صحبت میں زبان وصحت زبان کا ذکر تھا انہوں نے کیا خوب بات کہی کہ اگر کوئی بنگالی "ہاتھی آئی" کہتا ہے تو ہنسنے کی ضرورت نہیں، یہ دیکھو کہ اسکا مدعا تمہاری سمجھ میں آگیا یا نہیں۔ کیونکہ زبان کا مقصود یہی ہے۔ میں بڑی حد تک اس کا موافق ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ جو محاورے یا اصطلاحات گھوارہ سے کانوں میں پڑے ہیں۔ انکے خلاف اگر کوئی آواز آجاتی ہے تو تھوڑی دیر کیلئے سماعت مُشَوَّش ہو جاتی ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ میرے قیام حیدرآباد کے دوران میں اس مجموعہ کے کچھ اجزاء جناب تمکین کاظمی نے مجھے مطالعہ کیلئے مرحمت فرمائے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے اس خیال کے اظہار کا موقع ملا فقط

حیدرآباد دکن

۱۴۔ اپریل ۱۹۳۱ء

نیاز فتحپوری

تاشُ

از

مولانا احسن مارہروی پروفیسر ادبیات اردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

کہنے کو ہمارے منہ میں زباں ایک ہی، مگر بولتے وقت لب و دہن کی مختلف حرکات کی وجہ سے اس یکرنگ کی نیرنگیاں عجیب عجیب انداز دکھاتی ہیں۔ آپ کسی ایک لفظ کو لے لیجئے اور بولتے وقت اسی ایک لفظ کا لب و لہجہ بدلتے جائے، پھر دیکھئے کہ ایک لفظ اپنے ہر رو و بدل میں کیا کیا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ چُپ بمعنی خاموشی یا خاموش عام بول چال میں ہے۔ اب اس کے مفہومونکی تعداد گنئے۔

(۱) تحکمانہ لہجے میں (بصیغۂ امر)

(۲) پیار کے انداز میں (آواز نرم)

(۳) رازداری کا پہلو لئے ہوئے (آہستہ سے)

(۴) حیدرآبادی مفہوم میں بمعنی گزراں (تیہین)

ان مطالب کے سوا اور معنوی پہلو بھی اس لفظ میں حسب موقع نظر آتے ہیں جنکی تفصیل غیر ضروری سمجھی گئی۔ عام اردو جاننے والے خود سمجھ لیں گے۔ غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اسکی تدریجی حالت عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر مذہبی مواعظ اور روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب تنوعات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کیلئے ضروری اور جزو لاینفک ہے۔

اسالیب بیان کے یہ تغیرات فطری اور وہبی ہیں ان سے اختلاف کرنا گویا قدرت سے روگرداں ہونا ہے۔ جس طرح تلفظ کے انداز و ادا میں اختلاف ہے۔ اس طرح ہر متین اور ظریف مضمونکے بھی مراتب مدارج مختلف ہوا کرتے ہیں۔ خشک بیانی۔ بے کیف سخن آرائی نامربوط اور اجنبی زبان سنجیدہ مضامین کیلئے غیر دلچسپ ہے اور فحش یا عریاں مذاق بذلہ سنجی کے منافی۔ ہر مقرر و محرر کا فرض اولین ہے کہ جس بحث پر تقریر یا تحریر کی جائے اُن خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے جن سے ادب عالیہ کی توقیر ہوتی ہو نہ کہ توہین۔

غنچۂ تبسم جسکا نام بتا رہا ہے کہ یہ غنیۃ المصلی یا ازالۃ الاوھام

جیسی کتابوں میں شامل نہیں ہے بلکہ تفنّن طبع اور انشراح قلب کی دلچسپیاں بڑھانے کے لئے تالیف کیگئی ہے اس کا مذاق بیہودگی اس کا انداز بیان بدتمیزی سے دست وگریباں نہیں بلکہ الھزل فی الکلام کالملح فی الطعام کا مصداق ہے جس کے مصنف جناب تمکین کاظمی ہیں۔ اپنی نسبت اسمی کے لحاظ سے تو ان عزیز کو جبلِ ابوقبیس یا کم از کم اپنے ملک کے ایلورا غاروں[1] کی بابت کوئی مستحکم اور منجمد کتاب لکھنی چاہئے تھی تاکہ انکی تمکنت مسلم الثبوت ہوجاتی لیکن اس طرح عمل پیرا ہونے میں انہیں اپنی ایک خلقی اور پیدائشی خصلت سے اعراض کرکے کفران نعمت کا الزام اپنے سر لینا پڑتا۔

بہر حال میں نہایت مسرت سے انکی بذلہ سنجیوں کی داد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ انکی نثر کو بھی لسان العصر اکبر مرحوم کی نظم کے برابر مقبولیت نصیب ہو۔

ہندوستان کے اکثر کثیر الاشاعت جرائد و رسائل میں اب تک ان کے جو مزاحیہ مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان سب کو یکجا

---

[1] حضرت! چند روز انتظار فرمائیے۔ "غارہائے ایلورا" سے متعلق ایک کتاب تیار ہے جو عنقریب طبع ہوگی (تمکین)

کردیا گیا ہے جن کی مختصر مگر جامع تعریف یہ ہے کہ ؎

ہی غنچۂ تبسّم تمکینِ کاظمی
ایسا مذاق جس میں متانت ہی لازمی

احسن مارہروی

انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

۱۲ اپریل ۱۹۳۱ء

تعارُف

از

ضیاء الملک حضرت مُلّا رموزی، فاضل الٰہیات، ایم آر، اے، ایس، (لنڈن)
یم، ال، ایس، ے (امریکہ)

اگر کنوئیں کے برابر گہری اور تالاب کے برابر چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو زبان اُردو اور ادبیات اردو کیلئے یہ زمانہ وہ اللہ بخشی میر امّن دہلوی اور میر انیس لکھنوی کے زمانہ سے اسلئے کہیں اچھا ہے کہ اس زمانہ میں لکھائی چھپائی اور "لادنے" اور "لیجانے" کے ذرائع کافی ہیں اور انہی چیزوں سے روپیہ کمانے کی خاطر چند تجارت پیشہ لوگوں نے اردو میں جو رنگین اور چمکدار اور اونچے پورے اخبارات اور رسالے جاری کئے تو نام یہ ہوا کہ "اردو خاصی ترقی کر چکی" حالانکہ اونچی نظر والوں کا خیال ہے یعنی ملا رموزی کا کہ اگر اردو واقعی معنی میں کوئی ٹھوس ترقی کرتی تو سب سے پہلے وہ اپنے پرانے مولوی عبدالحق صاحب کی عزت افزائی کا بت اورنگ آباد میں کبھی کا نصب کر دیا جاتا اسلئے کہ جہاں اب مولوی صاحب ممدوح کے نام کے ساتھ لفظ "انجمن ترقی

اردو" تخلص سابن کر رہ گیا ہے۔ وہاں بھی ایک مولوی صاحب تھے جنہوں نے بی اے پاس کر کے بھی "ترقی اردو" کی زبردست خدمات انجام دیں مگر نتیجہ یہ نکلا کہ ایکہزار روپیہ ماہوار پر "الٹے" ملازم تو رکھ لئے گئے مگر خدمت ادب و زبان کیلئے آزاد نہ کئے گئے۔ اور مناصب یا جاگیریں پا رہے ہیں وہ جو پانیر اخبار کے سوا یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے والد کی زبان اردو تھی یا انگریزی؟

القصہ جو کچھ بھی ہوا، ہوا لیکن ملّا رموزی کی پسند کی دو چار باتوں میں سے ایک یہ بات بہت ہی عمدہ ہوئی کہ اس زمانے میں دو چار اہل قلم نہایت ہی بہتر پیدا ہو گئے جن میں سے باقی کے نام دل میں رکھکر صرف حیدرآباد کے بنے ہوئے مولوی تمکین کاظمی صاحب منشی فاضل، ایم، آر، اے، ایس، کا نام ظاہر کرتے ہیں پس واضح ہو کہ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی[۴] کی صلاحیت ہے یا نہیں یا وہ دس بارہ میل پیدل بھی چل سکتے ہیں[۵] یا نہیں وہ شیروانی[۶] کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟

۴؎ قطعاً صلاحیت نہیں ہے ورنہ ضرور آپ کو حیدرآباد بلاتا۔ ۵؎ بحمداللہ دس بارہ کیا بیس پچیس میل چل سکتا ہوں۔ ۶؎ بفضلہ کوٹ پتلون سے نفرت قطعاً نہیں کبھی کبھی اسے بھی پہنتا ہوں (تمکین)

وہ موزے پاجامے کے اوپر چڑھا کر پہنتے ہیں[1] یا اندر۔ وہ قمیص کے اوپر والا بٹن کھلا ہوا رکھتے ہیں[2] یا بند۔ وہ بازار سے سودا سلف خود لاتے ہیں یا اُن کا ملازم؟ اگر سودا خود ہی لاتے ہیں تو دوکاندار سے بے قیل و قال سودا خرید لیتے ہیں یا کچھ دیر اس سے یہ بھی کہتے ہیں[3] کہ

ابے مجھے دیتا ہے کہ نہیں؟

ابے اُلّو چلّا تو رہا ہوں کہ ڈھائی آنے کی دیدے ڈھائی آنے کی بس تو لا دھر دے میرے دام مجھے نہیں لینا تجھ سے!

ہاں ہاں بس ایک تو ہی تو لال سوداگر رہ گیا ہے حیدرآباد میں!

بلکہ ہمیں تو اس سے بحث ہے کہ مولوی تمکین صاحب مضمون نگار ہیں تو کیسے؟ اور اُن کے مضامین زبان اردو کیلئے کس حد تک مفید و موثر ہیں۔

ان دونوں سوالات کو اگر مولوی سلیمان ندویوں[1] ابوالکلام

---

[1] ایسی بدذوقی آج تک نہیں کی۔

[2] صرف شدید گرمیوں اور محرم میں [3] افسوس ہے کہ یہ آج تک نہ آیا۔

[4] شکر ہے کہ ایسا موقعہ کبھی نہیں ہوا صرف کتب فروشوں سے کبھی کبھار جھڑپ ہو گئی ہے وہ بھی مکتبہ والوں یا احمد حسین جعفر علی کی دوکان والوں سے (تمکین!

آزادوں کی قسم کے لوگوں کو دیدیجیئے تو استغفر اللہ وہ منطقی ترکیب و تحلیل و تنقید فرمائیں گے کہ دماغ کے دو تین طبق الٹ جائیں گے مگر کچھ سمجھ میں نہ آئیگا۔ اسلیے ہم تو ایک نہایت غریب مضمون نگار کی حیثیت سے ان سوالات کو حل کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی تمکین صاحب کی تحریروں کے وزن اون کے وقار انکی قابلیت انکی ترتیب انکی ادبیت اور انکی تاثیری حیثیت سے پہلے غور نہیں کیا جاسکتا ہے جو جیسا کہ اول آپ ہی مضمون نگاری کی تعریف کرکے کہا جا چکا ہے

چنانچہ صاف عرض کرتے ہیں کہ ہم [illegible] اپنے [illegible] برس کی عمر سے مضمون نگار ہو چکے ہیں اسلیے آپ کی غرض کی تحریر [illegible] سوال میں جو پہلا تجربہ ہوا وہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں میں یہ عادت ضرور ہے کہ وہ اپنے سے بہتر اور اپنے سے زیادہ مقبول [illegible] مضمون نگاری کی تعریف نہیں کرتے ہیں اگر بہت ہی [illegible] تو اور نقصان پہنچانے کی [illegible] شاعروں اور مضمون نگاروں کی [illegible] میں ایک آدھ مضمون [illegible] کسی محفل میں [illegible] کہدیا تو بہت کہا کہ [illegible] ہوا کہ ملا رموزی [illegible] تمکین کی [illegible] اچھا لکھنے والوں میں نہیں ہیں" اور یہ تمکین اگر کوئی ان سے [illegible] مضمون نگاری کی تعریف میرے نام سے لکھدیجیئے [illegible] ملا [illegible] لکھوں گا تو

۱؎ یہ بھی عجیب دلگی ہے کہ ملا صاحب کی عمر [illegible] اور مضمون نگاری کی مدت [illegible] برابر برابر ہیں صرف چند مہینوں کا فرق ہے۔ (تمکین)

پھر دیکھئے کہ جس رائے کو انہوں نے ملا رموزی اور تمکین کاظمی کے لئے معمولی الفاظ میں ظاہر کیا ہے اسی رائے کو اپنے لئے لکھتے وقت ایسے شاندار الفاظ میں لکھیں گے کہ دنیا اُن کے رتبۂ عالی کی قائل ہو کر رہ جائے لہٰذا اس عادت کے موافق "مجھ ملا رموزی بقلم خود" کی یہی عادت ہے کہ نہ کسی مضمون نگار کے مضمون کو کبھی پڑھنا نہ کبھی اسکی تعریف کرنا۔ مگر اسی عادت سے ایک یہ قانون بھی بن جاتا ہے کہ جو مضمون نگار کبھی کسی دوسرے مضمون نگار کی تعریف نہیں کرتا اگر وہ کبھی کسی مضمون نگار کی تعریف کرتا ہوا دیکھ لیا جائے . . . .

یا پہچان لیا جائے یا بھانپ لیا جائے یا تاڑ لیا جائے یا پکڑ لیا جائے یا سُن لیا جائے یا سمجھ لیا جائے یا جان لیا جائے یا مان لیا جائے تو پھر یقین فرما لیجئے کہ ایسے ہی مضمون نگار کی تعریف اصل اور صحیح تعریف ہو گی۔

لہٰذا ہم "رُو بقبلہ" ہو کر کہتے ہیں کہ ہم جو دہلوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اس لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی کہ "بس لکھ رہے ہیں" اور "چھپوا رہے ہیں" یعنے اُنکی "کثرتِ نگارش" اور "حوصلۂ عمل" اور اسی لئے تو ہم کسی ایسے مضمون نگار کے سلام کا جواب تک دینا پسند نہیں کرتے جو بڑے "طمطراق" اور "دبدبے" سے سال

ڈیڑھ سال تک برابر لکھتے رہے اور پھر کہیں ملازم ہوئے تو افسر صاحب کو سلام کرتے کرتے وہ اپنی تمام مضمون نگاری بھی بھول گئے اور شاعری بھی اب کبھی کبھی دوستوں کے کہے بغیر کوئی دقیانوسی مضمون اٹھا لائے اور یہ کہکر بیٹھے سنا رہے ہیں کہ دیکھئے ملا رموزی صاحب میں بھی کبھی "اودھ پنچ" میں مضمون نگاری کرتا تھا مگر کیا کہوں جناب کہ اس ملازمت نے کہیں کا نہ رکھا، اسلئے اب تو واللہ نہ کبھی اخبار پڑھنے کو ملتا ہے نہ کوئی رسالہ دیکھنے میں آتا ہے۔

سبحان اللہ کیا دلیل ہے آپکی اور کیا فخر فرما رہے ہیں آپ سال ڈیڑھ سال کی مضمون نگاری پر[1]، ارے کبھی آپ کے ہاتھ کسنے جوڑے تھے کہ آپ مضمون نگاری فرمائیں جبکہ آپ مالی مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور قدرت کے کارخانہ میں آپ "منشی جی" اور دفتری آدمی کہے جانے کے لئے ڈھالے گئے تھے۔

مگر تمکین کاظمی کہ یہ "اللہ کے بے حد لکھنے والے بندے" جب سے مضمون نگار بنے ہیں استغفر اللہ جو کبھی جمعہ کے دن بھی مضمون لکھنا ترک کیا ہو تو اس کثرتِ نگارش سے آپ کے نزدیک تمکین صاحب کی بہادری ثابت ہوگی اور اربابِ علم و فضل کے نزدیک اُنکی

---

[1] کیا فرماتے ہیں مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی الاصلاحی اس حسن ظن کے متعلق؟ (تمکین)

عالمانہ اور انشا پردازانہ فضیلت، کیونکہ جس شخص کے پاس علم و ادب اور حکمت و خطابت کا جتنا زیادہ ذخیرہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ لکھنے والا بن جاتا ہے اور جو یقین نہ ہو تو ذرا آپ اپنے ہاں کے "کوتوال صاحب" سے اتنے مضامین لکھوا لیجئے جتنے کہ تمکین صاحب لکھ چکے ہیں اور لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ مضمون نگاری نہیں ہے کہ سال بھر میں چار مضمون لکھ دیئے اور پھر ایک سال کے بعد ہی ملازمت میں یوں غائب ہو گئے کہ پھر نہ ہمیں اور نہ آپ کو ملیں اور نہ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کو!

مجھے یہاں تمکین صاحب کی عام مضمون نگاری، اُن کے مضامین کی محققانہ بلند نظری، عالمانہ پختگی اور ترتیب و تاثیر یہاں سے بحث نہیں جبکہ یہ تمام کمالات انشاء اُنکی تحریروں میں موجود ہیں مجھے تو یہاں اُنکی لطافت نگاری سے بحث ہے بس واضح ہو کہ اسوقت جبکہ ملا رموزی نے لطافت نگاری اور ظرافت تحریر دل کو انشا وار دو کا ضروری حصہ قرار دینے کی کوشش کا آغاز کیا اسوقت اردو میں تین چار آدمی ایسے تھے جو عید بقرعید پر ایک آدھ ظریف مضمون لکھ دیتے تھے ورنہ اردو میں لطافت نگاری کی یہی وہ قحط سالی تھی جس کے باعث اس قسم کے دو کہنہ مشق نگارش بھی حد سے سوا مشہور ہو گئے۔ ورنہ انہیں

اپنے ان چند اور۔ بہت ہی کم چند مضامین کے ذریعہ اتنا مشہور ہونا چاہیئے تھا۔ البتہ ملا رموزی کے بعد برادرم مولنا سالک بی اے، ایڈیٹر اخبار انقلاب لاہور" نے ظرافت نگاری میں جس استقلال اور کثرت نگارش کا ثبوت دیا وہ قابل تذکرہ ہے۔ ممدوح کے بعد ایسے نوجوان لطافت نگار بھی پیدا ہوئے جنہوں نے چند دن تو ملا رموزی اور سالک کے "پاؤں پر پاؤں رکھے" مگر سال ڈیڑھ سال کے بعد یہ بھی ایسے ٹھنڈے ہوئے کہ آج نہ اخبار رسالوں میں پتہ ملتا ہے اور نہ اخبارات کی ہمت آزما دنیا میں کیونکہ انہوں نے اخبار دنیا میں کبھی قدم ہی نہیں رکھا تھا تو واضح ہو کہ ایسے چند روزہ لطافت نگاروں کی تحریریں نہ زبان اردو کو کوئی فائدہ نہ انکے مخاطب حضرات کو کوئی لطف۔

اب اس کے بعد سوال یہ ہے کہ ظرافت کی صحیح تعریف کیا ہے اور صحیح معنی میں ظریف کسے کہہ سکتے ہیں، سو اس کیلئے یہ "علی گڈھ قسم کے لوگ" تو یورپ والوں کی لکھی ہوئی تعریفات کا ترجمہ پیش کر کے بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے جو تعریف پیش کی ہے بس وہ دنیا میں سب سے آخری تعریف ہے اور "دیوبند قسم کے لوگ" جب "اما بعد" لکھکر تعریف فرماتے ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ گویا کسی لغت کی کتاب کو نثر کر دیا ہے، مرجائیے مگر سمجھ میں ایک جملہ بھی نہ آئے، رہے اپنے ملا رموزی صاحب سو یہ بیچارے ایسے

آدمی ہیں کہ یہ نہ انگریزی سے دلیل پیش کریں نہ عربی سے بس نہیں تو وقت پر جو سوجھ جائے اور جو سمجھ میں آجائے اس لئے اسوقت انکی سمجھ میں ظرافت کی تعریف یہ آئی کہ

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے"
"جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو اور ظریف"
"وہ جو حد سے سوا ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے"
"اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف تحریر لکھ رہا ہوں"

بس یہی کمال ہے مولوی تمکین کاظمی کی تحریر میں اور انکی لطافت کا۔ اب رہا یہ سوال کہ آخر تمکین صاحب ظریف ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو کب سے ہوئے؟ کس طرح ہوئے؟ کیوں ہوئے؟ کس لئے ہوئے؟ کس واسطے ہوئے؟ کس کے ورغلانے سے ہوئے؟ اور اب جو بن چکے ہیں تو بنے ہی رہیں گے یا نہیں؟ سو آخری سوال کا جواب تو یہ ہے کہ وہ تو بنے رہینگے۔ مگر انکی مخاطب جماعت کبھی انکی قدر نہ پہچانے گی نہ انکی کتابوں کو خریدے گی نہ انکے مضامین کا معاوضہ دیگی نہ انہیں اردو کی یہ اورنگ آباد سے لیکر پنجاب تک کی ایک انجمن کوئی خطاب دیگی نہ کسی حکومت سے انہیں منصب علمی ملے گا!

غرض یہ ہے کہ جب قوم اور مخاطب جماعت کی ناقدردانی اور حوصلہ شکنی کا یہ عالم رہیگا تو ایک تمکین کاظمی کیا اگر ہزار تمکین کاظمی ہونگی تو چار و ناچار مضمون نگاری کو چولھے میں ڈالکر کسی دفتر میں ملازمت کر لینگے[۱] "مجھ ملا رموزی قوم مسلمان ساکن ہندوستان" کے خیال میں تمکین ایک ایسے ذی حوصلہ اور بلند مرتبہ صاحب قلم ہیں جو محض اپنے ثبات عمل اپنے بلند پایہ مضامین کے باعث دنیائے علم و ادب میں تمکین کاظمی بنے ہیں۔

تمکین کے مضامین میں جو ظرافت ملتی ہے اگر سچ پوچھئے اور سچ لکھوائیے تو ملا رموزی اسے ظرافت نہیں بلکہ "دریائے لطافت" اسلئے کہتا ہے کہ ظرافت تو وہ ہوتی ہے کہ پڑھنے اور مارے ہنسی کے چارپائی پر گر جائے یا دیوار سے ٹک جائے یا پیٹ پکڑ کر بیٹھ جائے اور لطافت وہ کہ پڑھیے اور ایک ہلکے سے سرور کے ساتھ مست ہو جائیے اسلئے انکی تحریروں میں غالب حصہ متانت اور رکھ رکھاؤ کا ہے اور بہت کم حصہ مذاق و تفریح کا مگر جس کم حصے میں انھوں نے ظرافت سے کام لیا ہے حق یہ ہے کہ وہ ظرافت اپنی اصولی بلندپائیگی

---

[۱] اجی حضرت ایسے کر رہے ہیں (تمکین)

اور تاثیر کے اعتبار سے نہایت درجہ قابل قدر اور دماغ میں وجد وکیف کی امنگیں پیدا کرنے والی ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ "میں ملّا رموزی ملازمِ سرکار بہ تنخواہ قلیل" جب تمکین کی لطیف تحریروں کو پڑھ کر مسکراتا ہوں ہنستا ہوں اور قہقہے لگاتا ہوں تو پھر کون ہے جو انکی روح پرور تحریروں سے بے خود نہ ہو جائے گا؟ کیونکہ میں اس قسم کا ملا رموزی واقع ہوا ہوں کہ ہر وقت اپنے چہرے کو افسردگی طرح "دبدبہ انگیز" بنائے رہتا ہوں، لوگوں سے بہت کم بات کرتا ہوں، بات بات پر لڑنے کو تیار مگر مرنے کو "ناتیار" اور تو اور مزاجی غرور یہ ہے کہ اپنے ہر مضمون میں اپنی تعریف خود لکھتا ہوں اور ذرا نہیں شرماتا اس لئے میری اس خودستائی پر میرے عیوض وہ بیچارے کوئی ڈھائی فٹ کے "نہا شاعر" شرماتے رہتے ہیں اور تاؤ کھاتے رہتے ہیں تو پھر ایسا شخص جب تمکین کی تحریروں کو اس بے خودی کے ساتھ پڑھے کہ "وہ" بھی دالان میں سے ہنس کر کہیں کہ "بس سمجھ گئے ہم وہی حیدرآباد والوں کا مضمون پڑھ رہے ہونگے آپ" گویا ہمارا کسی کتاب یا کسی رسالے کو پڑھ کر ہنسنا ہمارے ننھے میاں کی والدہ کے نزدیک صرف اسی وقت یقینی ہے جب کہ ہم تمکین صاحب کا کوئی مضمون پڑھیں۔ پھر جس مضمون کی

لطافت اور ظرافت کو شوہر کے ساتھ اسکی بیوی تک مان لے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تمکین کی لطافت نگارش سے انکار کرکے کون ہوگا جو خود کو کافر[1] قرار دیگا؟

تمکین صاحب کے ذیل کے مضامین "مرزا صاحب" "میر صاحب" "منشی جی" "بوکھلاہٹ" "جھٹکا" "عطردان" وغیرہ اوپر والی تعریف کے موافق اور نمونے ہیں۔ ان مضامین میں علاوہ ول نواز لطافت کے خاص سے بھی زیادہ اونچی خاص بات ان کے بیانکی سلاست ہے۔ اور بیان و مضمون کی آسان عبارت اور ترکیب ہی ایک ایسی صنعت ہے جو فن انشاء کا حسین ترجز ہے لہذا اس حساب سے میں تمکین صاحب کے مضامین کو بلند اور چوٹی کے مضامین کہنے کو تیار ہوں۔ انکی تحریر کا دوسرا حسن زبان اور محاورے کا اہتمام ہے اور اگر اس معاملہ میں لکھنؤ والوں کی طرح زیر، زبر اور پیش کے سہو کو کمزوری اور "نالیاقتی" نہ کہا جائے تو میں کہتا ہوں کہ تمکین کی تحریریں ہر طرح اردو کی جان ہیں اور مال بھی۔ ان کی تحریر کا تیسرا حسن یہ ہے کہ وہ جس عنوان پر لکھتے ہیں

---

[1] لیجئے اب مُلّا صاحب کفر کے فتوے بھی دینے لگے اللہ کرے یہ "تہانہ ہوتی" رنگ اور زیادہ ہو (تمکین)

اس میں وسعت نظر، تحقیق اور جزئیات کا بڑا مکمل ذخیرہ موجود ملتا ہے پھر ان خوبیوں کے بعد اگر آپ چاہیں کہ وہ کفر کے فتوے بھی لکھیں۔ تب مضمون نگار ہائیں تو یہ آپ کا ذوق، ورنہ مضمون نگاری کے اصول سے کچھ شک نہیں کہ اونکے مذکورہ بالا مضامین وہ ہیں جن کے پڑھنے سے دل و دماغ اور روح کو "حیاۃ آرا جوش" "خوشی" "دمستی" اور "بیداری" نصیب ہوتی ہے۔

پھر اگر آپ شوہر ہو کر اپنی بیوی کو مسرت و زندہ دلی کی دولت سے شاد کام بنانا چاہتے ہیں تو ان کے ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ[1] سے محفوظ ہو جائے۔ کیوں کہ مان لیجئے کہ جو شخص تمکین کاظمی کے ان بہار افروز و عالم آرا مضامین کو نہ پڑھیگا خدا ہی ہے جو وہ دوزخ سے محفوظ رہے

اور ہاں انکی تحریر کا چوتھا حسن یہ ہے کہ وہ دن کی روشنی سے محروم ہیں یعنی "ملازمت پیشہ اور قوم سید ہیں"۔ مگر اس قید و بند پر وہ اس درجہ دلکشا تحریر سے زبان اردو میں ادب لطیف کا خزانہ بہم پہونچا رہے ہیں۔ اللہ انہیں اور ملا رموزی کو ملازمت کی قید سے

---

[1] مسلمانوں عبرت حاصل کرو (تمکین)

آزاد کر کے ذرا "منصب[۵] دار" یا "جاگیردار" تو بنا دے، پھر بتا دینگے کہ یہ دنیا میں صرف انگریز بھائی ہی زندہ دل ہوتے ہیں یا ہم ہندوستانی بھی!

بھوپال
۶ اپریل ۱۹۳۱ء

ملّا رموزی

۵۔ ملّا صاحب کی دعا سے منصب تو ہمیں اب بھی ہے خدا کرے اب ہماری دعا سے ملا صاحب کو منصب اور جاگیر ہو جائے (تمکین)

تقریب

از

مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی

بی اے (علیگ) ال ال بی (عثمانیہ) یم آر اے ایس (لندن)

میں چاہتا ہوں کہ کتاب پر کچھ لکھنے سے پہلے مصنف کے حالات بھی بیان کردوں تاکہ پڑھنے والے بے خبر نہ رہیں۔

تمکین صاحب کے اجداد ابتداً عرب سے بخارا گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ چونکہ یہ لوگ ہاشمی النسل اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اسلئے بخارا میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز ہوگئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے سید بابا خواجہ سیاحت کناں وارد ہوئے اور پھرتے پھراتے دکن پہونچے تو حیدرآباد میں اپنے ہموطنوں اور خاندان کے لوگوں کو بڑی بڑی خدمات پر فائز دیکھ کر خود بھی مستقل سکونت اختیار کرلی سید محمد طالب میر عسکر بخارا اور سید محمد عسکری صدر الصدور انہیں کے ہم جد تھے جن کے پوتے نواب فریدوں جنگ رفیع الدولہ حیدالملک[1] تھے چونکہ اس زمانہ میں

---

[1] نواب رفیع الدولہ حیدر الملک بہادر دکن کے مشہور امراء سے تھے جن کے پوتے نواب

شرفاء کی قدر و منزلت خاص طور پر کیجاتی تھی اور تازہ ولایت شرفاء کو

ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اسلئے نواب میر معنی خاں[۵۱] بہادر نے اپنی صاحبزادی

سے جو نواب عبد اللہ خاں بہادر صوبہ دار آرکاٹ کی نواسی تھیں۔

سید بابا خواجہ کے فرزند سید ایوب خواجہ کی شادی کردی اور اس ا زدوا

قرابت کے بعد سے ایوب خواجہ کی آمد و رفت دربار شاہی میں شروع تحصیلدار

ہوگئی۔ سید ایوب خواجہ کو پہلے میر سیادت علی خاں بہادر اور گلبرگہ میں

یار جنگ خطاب معہ لوازمات اور تعلقہ مشکی مدگل باجمعیت خزانہ دار مقرر ہوئے

۳۱ ... ۱۳۳۱ف سے

نواب سید یار جنگ بہادر کے کئی ایک لڑکے لڑکیاں

چنانچہ سب سے بڑے فرزند نواب سید نورالحسن خاں ... تحصیلدار رہے

اورنگ آباد کے میر عدل اور صدر تعلقدار تھے اور ... سے ۱۷ ماہ صفر ۱۳۲۶ھ

کے علاوہ پانصدی منصب اور آٹھ ہزار سالانہ رہا۔ حضرت تجلّی کو یوں تو

تنخواہ سے سرفراز تھے آپ سے نواب عزت یار خاں ... لڑکے باقی رہے جن میں

محی الدولہ[۵۲] کی صاحبزادی بیاہی گئی تھیں آپنے ... ملین کاظمی ہیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد

---

[۵۱] میر معنی خاں بہادر، پانصدی منصب اور لوازمات سے سر

تھے "کوچہ میر معنی خاں" ابتک مشہور ہے۔

ر ہ لو حضرت بہبود علیشاہ قبلہ کے مرید

[۵۲] عزت یار خاں بہادر محی الدولہ (ثالث) مغفرت منزل نواب قطب الدین محمود علی مرحوم معتمد

خدمت صدارت اور احتساب بلدہ کے علاوہ جاگیر اور منصب سے بھی مستفیض اور ڈاکٹر دولی الدین آپ ہی کے پوتے ہیں

افغانی نے جبکہ آپ میانے میں بیٹھے ہوئے تشریف لیجارہے تھے خنجر

مطابق ۶ ماہ ڈسمبر ۱۸۵۸ء کو انتقال کیا اور چار لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی
یادگار چھوڑیں جن میں سب سے بڑے نواب میر سیادت علیخاں بہادر تھے
جو خدمت نیابت دوم دیوانی بلدہ اور آبائی منصب اور خطاب خانی
دری سے سرفراز تھے۔

نواب سیادت علیخاں بہادر نے چار شادیاں کی تھیں چنانچہ چوتھی
اب عزیز الدین خاں بہادر بخت بلند جنگ کی صاحبزادی
کے بطن سے مولوی سید منتخب الدین تجلی تولد ہوئے۔
حالات بھی: تجلی حیدرآباد کے مشہور شعرا سے تھے اور مولوی تمکین
تمکین ی اور فارسی کی تکمیل مدرسۂ دینیہ نظامیہ اور دار العلوم
مستقل سکونت کی تھی۔ حدیث فقہ وغیرہ کی تعلیم خانگی طور پر پائی
کاظم علیہ السلام کی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی کلام ترک
فائز ہو گئے۔ ہٰذا اردو نواب فصیح الملک داغ دہلوی کو دکھایا
کناں وارد ہوئے

سنہ ۱۲۹۲ھ

اپنے ہموطنوں اور خ
خود بھی مستقل سکونت والد کے انتقال کے تیسرے روز ۸ ربیع الثانی
کو تولد ہوئے بچپن تک اپنی خالہ نواب
محمد عسکری صدر الصد در کی بیگم صاحبہ کے زیر پرورش رہے
فریدوں جنگ رفیع پہنچنے کے بعد علاتی بہنوی نواب میر

سلہ نواب رفیع الدولہ حیدر الما
[illegible]

غیاث[۵] الدین علیخاں بہادر کے زیر نگرانی تعلیم پائی ۱۳۱۸ھ (۱۸۹۰ء) میں مولوی
سید عبدالرحیم صاحب تعلقدار کی صاحبزادی اور مولوی سید محمد یوسف الدین
مرحوم صوبہ دار گلبرگہ شریف کی ہمشیرزادی سے شادی کی ۱۳۱۱ف میں
موعود الخدمتہ تحصیلداری ہوئے اور بحیثیت اتاچی معتمدی مالگزاری
میں کام کرتے رہے ۱۳۱۴ف سے مختلف تحصیلات پر منفرم تحصیلدار
کی حیثیت سے کارگزار رہے ۱۳۱۶ف میں صوبہ داری گلبرگہ میں
آپ کا تقرر ہوا اور ۱۳۱۸ف میں ضلع رائچور کے صدر خزانہ دار مقرر ہوئے
۱۳۲۲ف میں عثمان آباد کے محاسب ہوگئے۔ ۱۳۱۴ف سے ۱۳۲۳ف
تک مستقلانہ خدمتہ تحصیلداری نہ مل سکی مگر ہمیشہ منفرم تحصیلدار رہے
۱۳۳۰ف میں گلبرگہ شریف پر خزانہ دار ہوکر آئے ۱۷ صفر ۱۳۴۶ھ
م ۱۶ اگست ۱۹۲۷ء کو گلبرگہ ہی میں انتقال کیا۔ حضرت تجلی کو یوں تو
کئی ایک لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں مگر صرف تین لڑکے باقی رہے جن میں
سب سے بڑے مولوی سید مصباح الدین تمکین کاظمی ہیں۔

تمکین صاحب ۲۶ شعبان ۱۳۲۰ھ م ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد

---

۵ یہی نواب غیاث الدین علیخاں بہادر تھے جو بعد کو حضرت بہبود علیشاہ قبلہ کے مرید
اور خلیفہ ہوکر میر غیاث الدین علیشاہ بن گئے۔ مولوی قطب الدین محمود علی مرحوم معتمد
بارگاہ آپ ہی کے فرزند تھے اور ڈاکٹر میر ریاست علی اور ڈاکٹر ولی الدین آپ ہی کے پوتے ہیں

میں تولد ہوئے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور والد کے نگرانی میں پائی اور پھر دھرم ونت اسکول، مدرسہ اعزہ، مدرسۂ مفید اراں، مدرسہ مفید الانام اور دارالعلوم بلدہ میں فارسی، عربی اور انگریزی تعلیم پائی چونکہ آپکی والدہ نے مولوی سید محمد یوسف الدین صاحب مرحوم صوبہ دار گلبرگہ کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اسلئے آپکی ابتدائی تعلیم بھی نہایت عمدہ ہوئی۔ حضرت تجلی خود شاعر اور ادیب تھے اور ہمیشہ علمی ادبی صحبتیں گرم رہتی تھیں اسلئے آپ پر بھی خاصا اثر ہوا اور آپ نے بھی شعر کہنا شروع کیا ابتدًا حضرت کیفی حیدر آبادی کو غزل دکھاتے رہے اور پھر حضرت محمد علیخاں ناظم سے مشورہ کیا مگر جلد ہی شاعری سے جی اکتا گیا اور ایک دیوان مکمل کرکے شاعری ختم کردی اور یہ اچھا بھی ہوا۔

چونکہ نثر سے بہت دلچسپی تھی اسلئے مضامین لکھنے کا شوق ہوا ابتدًا اخبارات میں سیاسی اور اقتصادی مضامین لکھا کئے مگر بعد میں تاریخ اور ادب سے کچھ ایسی دلچسپی ہوی کہ اسی کے ہو رہے!

قوم السلطنتہ وزیر خارجہ ایران کے فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ کئے ہوئے ناول "معاشقۂ نپولین" اور گیٹے کے شاہکار "ورتھر" کا ترجمہ میری شرکت میں فارسی سے اردو میں کیا اور آسکر وائیلڈ کے ڈرامے

"دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" کو میری شرکت میں انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ قویم السلطنتہ کے ایک اور فارسی ناول "شورش پرتوگال" اور ملکم خاں ناظم الدولہ کے ڈراموں " تیاتر" کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ چونکہ ریختی سے شغف تھا اور اس کا مطالعہ زیادہ کرتے رہے اسلئے شعراء ریختی کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیدیا اب اردو شعر کہنے والی خواتین کا ایک مبسوط تذکرہ ترتیب دے رہے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک عمدہ چیز ہوگی ابتک سینکڑوں خواتین کے حالات اور کلام کے نمونے جمع کر لئے ہیں اور اس کاوش اور محنت سے اسکو ترتیب دے رہے ہیں کہ میرے خیال میں ابتدائے آفرینش اردو سے ابتک کی شاید ہی کوئی اردو شعر کہنے والی عورت ہوگی جس کا کلام انہوں نے فراہم کیا ہو۔

آجکل ہیومرسٹ (خوش مذاق) میں وہ صفات ڈھونڈھے جاتے ہیں جو ایک نقال یا مسخرے یا بھانڈ میں ہونے چاہئیں اگر یہی معیار چند روز قایم رہا تو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی خوش مذاق نہیں ملیگا بلکہ نقال، مسخرے، اور بھانڈ رسائل وصحائف کے اوراق پر منہ چڑھاتے نظر آئیں گے۔ غضب تو دیکھئے کہ آج ہر وہ شخص

ظرافت نگار بنا بیٹھا ہے جو حد درجہ گرے ہوئے اور رکیک مذاق سے صرف لوگوں کو ہنسادے اور بس زندہ دلانِ ہند نے وہ داد ظرافت دی کہ نہ صرف ایسے بیہودہ نگار ادیب بنا دیئے گئے بلکہ خاصے ظرافت نگار اور خوش مذاق بھی تسلیم کرلئے گئے ع

طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور نہایت عمدگی سے لکھتے رہے ان کے بعد اور لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کرسکے عظمت اللہ خاں مرحوم اور رشید احمد صدیقی نے اسی رنگ کو ذرا بدل کر بالکل علمی بنا دیا اور موٹے موٹے فلسفے اور نفسیات کے مسائل اسی طرز انشا میں ادا کرنا شروع کیا مگر ان حضرات کے مضامین کا معیار ذرا بلند تھا اسلئے عام لوگ انہیں زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور یہ رنگ زیادہ مقبول نہیں ہوا خدا غریق رحمت کرے عظمت اللہ خاں نے بے وقت داغ مفارقت دیا اور رشید صدیقی نے مکروہات دنیا میں پھنس کر چپ سادہ لی ان کے بعد پطرس نے لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا مگر دو ہی ایک مضمون پطرس کے ایسے ہیں جو مقبول ہوئے چنانچہ

" کتے " اور " میں بھی ایک میاں ہوں " کے بعد کوئی مضمون ان کا اس قابل نہیں رہا جو قابل تذکرہ ہو یقین نہ ہو تو " مضامین پطرس " دیکھ لیجئے
اسی زمانہ میں مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

مضامین فرحت حصہ اول و دوم دیکھ ڈالئے " مشاعرہ " " ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی " " عالم بے کسی اور بے بسی " اور " کل کا گھوڑا " فرحت صاحب کے شاہکار ہیں۔

ملا رموزی نے بھی عجیب دل و دماغ پایا ہے ابتداً گلابی اردو کی سوجھی تو وہ وہ باریکیاں دکھائیں کہ سبھوں نے لوہا مان لیا اور پھر " لکات " کی طرف توجہ کی تو خاصا " لائٹ ہیومر " لکھنے لگے چنانچہ " لکات رموزی " حصہ اول و دوم " صبح لطافت " " شادی " جیسے ضخیم چار مجموعے مکمل کر دیئے اور اب " عورت ذات " کے نام سے ایک مستقل کتاب زیر طباعت ہے اور مختلف رسائل میں ان مجموعوں کی طباعت کے بعد جو مضامین طبع ہوئے وہ خود اتنے ہیں کہ انہیں طبع کر دیا جائے تو اور دو تین مجموعے ہو جائیں۔

ملا رموزی نے سادگی بیان اور ظرافت کو پیش نظر رکھکر لکھنا شروع کیا اور اسی سلسلہ میں علمی، ادبی، اخلاقی، سیاسی، فلسفی، معاشی،

ہر قسم کے رموز و غوامض قلمبند کرتے رہے مگر اس اطمینان سے کہ پڑھنے والا سمجھے اور سمجھ کر ہنسے اور پھر غور کرے۔ شگفتگیٔ تحریر اور طنز نگاری مُلّا صاحب کا طرۂ امتیاز رہی ہے بعض مضامین مُلّا صاحب کے ایسے بھی طبع ہو جاتے ہیں جو ان کے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہوتے اسکی وجہ انکی عدم توجہی نہیں ہوتی بلکہ "اجرتی مضمون" بے وقت لکھنا اور "غیر خوش باشانہ" (بغیر موڈ) وقت کی فکر کا نتیجہ ہوتا ہے مگر ان سے قطع نظر کر لیجائے تو ملا صاحب اس کے مستحق ہیں کہ انہیں ہیومرسٹ مانا جائے اور بہترین ظرافت نگار تصور کیا جائے انہیں دنوں امتیاز علی صاحب تاج نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھنے لگے مگر ایک ہی دو مضامین کے بعد انہوں نے اسے ختم کر دیا۔

اس کے بعد سے تو ایک طوفان بدتمیزی بپا ہو گیا۔ ہر نا اہل و ناکارہ نے خوش مذاقی شروع کی کسی نے بڑے طمطراق اور شان و شوکت سے لکھنا شروع کیا تو کوئی فتنۂ محشر بن بیٹھا کسی نے اظہار انکسار کیلئے نا اہلی اور ناکارگی کا اعلان کر دیا تو کوئی فقط "کوئی" ہو کر رہ گیا مختصر یہ کہ

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی
آپ ہی کہئے کہ آبروئے شیوۂ اہل نظر کیا باقی رہتی ہے؟

اس کے ذمہ دار یہ رکیک نویس اور ناکارہ نگار نہیں ہیں بلکہ مدیران رسائل اور رئیس التحریران مجلات و اڈیٹران جرائد ہیں۔ برساتی کیڑوں کی طرح رسائل اُبل پڑے مگر لکھنے والے وہی رہے جو پہلے تھے بھلا ایک ایک آدمی کتنے کتنے رسائل کیلئے مضامین لکھتا؟

نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے لکھنے والوں نے ان جدید رسائل کی طرف سے کم توجہی برتی اور وہ "اطفالِ دبستاں" جو ابھی "مدرسوں" ہی کی چہار دیواری میں خواب طفلی دیکھ رہے تھے اور روزانہ اُوٹ پٹانگ مضامین لکھ لکھ کر رسائل کو بھیجا کرتے تھے اور وہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جاتے تھے اب خاصے ادیب، ظرافت نگار اور کیا اور کیا بن گئے ؎

ہتو شا باش کیا کہنا ترقی اسکو کہتے ہیں
نہ ترشے تھے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھیرے

رسائل کی بہتات اچھے لکھنے والوں کا فقداں اور ایسے ناکاروں کی کثرت اب بھلا اردو کی پہلی تک پڑھے ہوئے "رئیس التحریر" اور "مخزن المفردات" تک پہونچے ہوئے حکیم جی انہیں ناکارنگار کو کار آمد سمجھ کر نہ چھاپیں تو کیا کریں کیونکہ عرب میں گھوڑے جب گراں ہوگئے اور لوگوں میں خریدنے کی استطاعت نہیں رہی تو

کام لینے لگے لمبے کان والے جانور سے! یہی ترکیب اگر پنجاب لکھنؤ دلّی کے رسالے والوں نے کی تو کیا بُرا کیا؟ آپ کو بُرا ماننے کا کیا حق ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے!

اس زمانہ میں جبکہ یہ بے تکی چل رہی ہو کوئی شخص کسی اچھے لکھنے والے کے مضامین پیش کرے تو کس طرح پیش کرے تمکین صاحب نے تو سرے سے مقدمہ لکھنے کی مخالفت ہی کی تھی صرف مجھ سے خواہش کر رہے تھے کہ ترتیب پر اظہار خیال کر دوں مگر بغیر ان چیزوں کے اظہار کے جو قبل ازیں ظاہر کی گئیں اظہارِ خیال بے کار تھا اور پھر سرسری اظہار خیال کرنے سے نہ کرنا اچھا تھا چنانچہ مجھے مجبوراً اِن چیزوں کو ظاہر کرنا پڑا ممکن ہے کہ اِن سطور سے بعض لوگوں کو تکلیف ہو اور بعض بہی خواہانِ ناکارگان خیر خواہانِ ظرافت نگاران باعظمت و شوکت نعل در آتش ہو جائیں اور مدیران و رئیس التحریران کو بھی اِن الفاظ سے تکلیف ہو مگر مجبوری یہ ہے کہ

اَلحقُّ مُرٌّ

انہیں حضرات کی خفگی اور دل آزاری کے خوف سے ہم نے چند اشارے کر دیئے ہیں ؎

اندکے از غمِ دل گفتم و خاموش شدم	کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

(اقبال)

تمکین کی ظرافت نگاری میں آپ کو عام جملے ملینگے نہ پیٹینٹ فقرے اور نہ وہ رکیک نداق نظر آئیگا جو عام طور پر آج کل کے مضمون نگاروں میں پایا جاتا ہے ۔

حضرت ملا رموزی سیاسیات کی وجہ مشہور ہوئے۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ نے گذشتہ تہذیب و تمدن کے ماتم میں نام پایا۔ پطرس نے چند بے ساختہ جملوں کو جوڑ کر خاص کیفیت پیدا کر دی اور بس انہیں سے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی زبان کا کیا کہنا ماشاءاللہ دہلی کی میٹھی میٹھی آب حیات سے دھوئی ہوئی زبان صاف ستھرہ روزمرہ ملا رموزی صاحب کی اردو بھی ماشاءاللہ بامحاورہ اور اچھوتی۔ البتہ پطرس صاحب گو نے کا استعمال اور "زندہ دلوں" کی طرح غلط نہیں کرتے مگر زبان پر تب بھی "امروہہ پن" خاصا موجود ہے باوجود سلاست نگاری کے ایک وزن پڑھنے والے کے دل اور دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے اور زبان بھی ذرا لڑکھڑانے لگتی ہے

ان کے مقابلہ میں تمکین صاحب کی زبان ~~پطرس سے کہیں بہتر~~ بہتر ملا رموزی کے برابر برابر ہے۔ انکی زبان میں مرزا فرحت صاحب کی سی مٹھاس اگر نہیں تو گراں باری بھی نہیں ہے میری دانست میں ملا رموزی، مرزا فرحت اور تمکین تینوں اپنے اپنے رنگ میں کمال ہیں

دین اللہ کی ہے رنگ ہے اپنا اپنا

جی چاہتا ہے ان تینوں ظرافت نگاروں کے مضامین کا مقابلہ کرکے دکھاؤں کہ کس پر کس کو فوقیت ہے مگر میرا منشا یہ نہیں کہ تمکین کو ملا رموزی یا فرحت اللہ سے بڑھادوں میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تینوں اپنے اپنے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمکین میں فرحت اللہ کی سی بے ساختگی اور شیرینی الفاظ موجود ہے تو ملا رموزی کی سی طنز نگاری اور چلبلاہٹ بھی بدرجۂ اتم ہے۔ پطرس کی سی لطافت خیال ہے تو سجاد کی سی جدت بھی ہے بہر حال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے اور میں جس شخص کو پیش کر رہا ہوں وہ موجودہ دور کے لکھنے والوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہیں۔

اردو میں سرے سے لائٹ ہیومر (خوش مذاقی) ہی مفقود تھا اگر کچھ تھا بھی تو صرف مزاحیات کی حد تک تنقید فکاہی اور طنزیات سے لوگ آشنا ہی نہ تھے بعض لوگوں نے ایک آدھ مضمون لکھ دیا مگر کسی نے مستقل طور پر "فکاہیات" کو اپنا عنوان نہیں بنایا اسی کی ایک کڑی تشخص نگاری بھی تھی جو سرے سے اردو میں تھی ہی نہیں اردو میں تشخص نگاری کو مستقل طور پر رواج دینے اور اس موضوع پر بے تکلف قلم اٹھانے کا

فخر اگر کسی کو حاصل ہے تو وہ تمکین ہیں کہ انہوں نے "میر صاحب" "مرزا صاحب" "خانصاحب" "مولوی جی" "منشی جی" لکھ کر بقول وکٹر ہیوگو یہ ثابت کر دیا

"ہر ایک چیز کا ایک عنوان اور ہر چیز کسی صاحب کمال کی "منتظر ہے وہی پیش پا افتادہ باتیں جن پر ہم قلم اٹھانا کسی "زمانے میں خلاف علمیت سمجھتے تھے آج دنیا کے ادب میں "عظمت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور ان پر روشنی ڈالنا "معراج کمال کا ثبوت ہے"

ہربرٹ ایلس کہتا ہے۔

"جو کچھ دنیا میں ہو سکتا ہے بیان کیا جا سکتا ہے مگر ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اسے بیان کرنا جانتا ہو"

اسکو پیش نظر رکھکر آپ "چارلی چاپلن کا تماشا" "بوکھلاہٹ" "مضمون کیسے لکھتے ہیں" "ہم اور ہماری عید" "ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے" پڑھئے دیکھئے کیسے پیش پا افتادہ اور روزمرہ کے واقعات کس مزے سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہی حادثات آپ پر بھی گزرتے ہیں، مگر آپ انہیں قلمبند نہیں کر سکتے اسی لئے تو "نوالس" نے کہا ہے "ہماری زندگی کے تمام واقعات مواد ہیں جن سے ہم جو چاہیں بنا سکتے ہیں"

مگر اس مواد سے کام لینا ہر ایک کا کام نہیں ہے اسکے لئے کسی تکمین ہی کی ضرورت ہے۔

ادب اس کا نام نہیں کہ ہائے ولائے کے دُم چھلوں کے ساتھ چند نامربوط اور بے تکے الفاظ جوڑ دیئے جائیں اور نامانوس ترکیبوں کے ساتھ ایک مضمون مرتب کر دیا جائے کہ "وہ ناچ رہی تھی اور میں مر گیا" اور اسی بات کا تبنگڑ بنا کر صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیئے جائیں آج کل عام رجحان اس قدر خراب ہو گیا ہے اور بد ذوقی اتنی عام ہو گئی ہے کہ ہر ایسا مضمون جسکا تذکرہ کیا گیا ادب لطیف خیال کیا جاتا ہے۔ عجب ثم العجب! "میتھو ارنلڈ" کہتا ہے۔

"ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے"

اسکی توضیح "آردی گاربان" نے اسطرح کی ہے۔

"کسی چیز کو دیکھنے کے بعد اسکے متعلق جو خیالات ہمارے دماغ میں پیدا ہوں انہیں بہترین الفاظ میں قلمبند کر دینا ادب ہے"۔

آپ "جھوٹ"۔ "جھٹکا"۔ "منشی جی" کا مطالعہ کیجیئے اور پھر ان دونوں اقوال پر غور کیجیئے خود سمجھ میں آجائے گا کہ ادب کیا ہے حیدر آباد دکن کی طرز معاشرت تاریخ اور تمدن سے جس قدر ان مضامین کو تعلق ہے اتنا ہی ادب سے بھی تعلق ہے یوں تو دکن کی

سینکڑوں تاریخیں لکھی گئیں لیکن کسی میں بھی آپ کو حیدر آباد کے معاشرتی پہلو تمدنی نکات اور معاشی باتیں نہیں ملینگی مگر آپ "میر صاحب" "مرزا صاحب" "مولوی جی" "منشی جی" "خانصاحب" "گھبراہٹ" "جھوٹ" "جھٹکا" پڑھ کر حیدر آباد کی سینکڑوں ایسی باتوں سے واقف ہوجائینگے جنھیں کبھی آپنے سنا ہی نہیں ہے۔

کبھی آپ حیدر آباد کے محرم میں "لنگر" دیکھ رہے ہونگے۔ "زنگ" کھڑا ہوا نظر آئے گا۔ "لعل صاحب کی سواری" "ندی کا میلہ" بھی آپ کے پیش نظر ہونگے تو کبھی آپ حیدر آباد کی طغیانی کے حالات پڑھ کر یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ کے سامنے ہی سب کچھ ہوا ہے، کہیں آپ کو "آخری چہار شنبہ" کے جلسے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پارٹیوں کا حال نظر آئے گا تو کہیں حیدر آباد کی سب سے پہلی اجرت پر لکھنے والی ہستی "منشی" کو دیکھیں گے کبھی آپ کو حیدر آباد کے "جھٹکے" اور "جھٹکے والے" سے روشناس کرایا جائے گا تو کبھی "سیکل" سے بہرحال آپ از جزو تا کل چھوٹی سے چھوٹی بات تک دیکھ لینگے اور محسوس کرنے لگیں گے کہ حیدر آباد کیا تھا کیا ہوگیا اور آئندہ کیا ہونے والا ہے؟

کون کہہ سکتا تھا کہ "طغیانی" میں برباد ہو کر حیدر آباد پھر

"عروس البلاد" نے کا کسے خبر تھی کہ محرم کے "رنگ" "رسوانگ" "میلے ٹھیلے" "جاترا" "جھگڑے" اسطرح غائب ہو جائیں گے کہ آج اُن کا تذکرہ گذشتہ تہذیب تمدن کی یاد دلانے والا ثابت ہوگا کسے خبر تھی کہ حیدرآباد سے "پتنگ بازی" "مرغ بازی" "بیٹر بازی" "کشتی" "بنوٹ" "بانک" ۔ چھری ۔ گدکا ۔ جاکر ۔ سینما ۔ ناٹک ۔ ٹاکنگ فلم ۔ ٹینس ۔ اور بیاڈمنٹن" رہ جائیں گے ۔ کون کہہ سکتا تھا کہ "رتھ" "برقعہ گاڑی ۔ ڈولی ۔ میانہ ۔ پالکی ۔ نالکی ۔ ہودہ ۔ عماری شکرم ۔ جوڑی ۔ چکڑا ۔ جاکر ۔ جھٹکہ ۔ سکتا رہ جائیگا اور "موٹر ول" کی وہ کثرت ہو جائے گی کہ بہترین سے بہترین کار ہر گلی کوچے میں "تیار" ملیگی" کون واقف تھا کہ حیدرآباد والے شاہا ۔ جھبہ ۔ عمامہ ۔ شملہ ۔ انگرکھا ۔ کلی چھوڑکر "ترکی" اور ایرانی بلکہ امان اللہ خانی" ٹوپی پر اُتر آئیں گے اور شیروانی" کو ملکی لباس بنالیں گے ۔ ساتھ ہی ساتھ "کوٹ پتلون ۔ ٹرکش کوٹ" واٹرپروف بھی جزو لباس ہو جائیں گے اور فلٹ کیپ اور سن ہیٹ کا عام رواج ہو جائے گا سچ ہے ۔

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

تمکین کے اُن مضامین سے آپ کو حیدرآباد کی تمام اخلاقی حالت بھی کما حقہٗ معلوم ہو جائے گی۔ "رسکن" کہتا ہے۔

"کسی قوم کا ادب اسکی اخلاقی حالت کا صحیح ترجمان ہوتا ہے"

"عورت اور اسکی نفسیات" پر تمکین مدت سے عبور حاصل کر رہے ہیں، چنانچہ اس موضوع پر انھوں نے ذاتی مشاہدے اور شخصی مطالعے کے علاوہ بہترین ذخیرہ کتب بھی فراہم کر لیا ہے، چنانچہ آپ "عطردان" "بدحواسی"، "چارلی چاپلن کا تماشا"، "بوکھلاہٹ۔ ہم اور ہماری عید" "مضمون کیسے لکھتے ہیں۔ ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے۔ شادی سے پہلے" پڑھ کر اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ تمکین نے عورت کو کس قدر سمجھ لیا ہے۔

یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہو گی کہ تمکین ابتک مجرد ہیں اللہ واسطے کو "منگنی" تو کر لی ہے[1]۔ مگر اس بے تکلفی سے عورت کے متعلق قلم اٹھاتے ہیں کہ بعض لوگوں کو اس امر کا یقین اور پختہ یقین ہے کہ تمکین شادی شدہ اور "گھر داماد" ہیں[2]۔

انہیں مضامین سے آپ کو تمکین کے چند خاص خاص اور زیادہ ملتے جلتے رہنے والوں کا کردار (کیرکٹر) بھی معلوم ہو جائے گا اور

---

[1] انشاءاللہ کبھی شادی بھی کر لینگے۔ [2] خدا نکرے۔ (تمکین)

پھر خود تمکین کا "نظام الاوقات" بھی نظر آئے گا اور مصروفیت بھی ——

ان مضامین میں تمکین نے اپنی زندگی کے اکثر واقعات کو بالکل صحیح طور پر بے نقاب کر دیا ہے اور ایسے پوست کندہ حالات جنکو ظاہر کرنا لوگ عین بدنامی تصور کرتے ہیں تمکین نے بکمال جراءتِ اخلاق لکھ دیا ہے اور اس مزے سے کہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

کہنے کے بجائے ان واقعات کا اظہار بے انتہا مفید اور ناصحانہ ثابت ہوگا۔ ممکن ہے کہ آیندہ کوئی شخص تمکین کی سوانح حیات لکھنے بیٹھے تو یہ واقعات اسے مواد کا کام دینگے[1]

ہندوستان نااتفاقی کے ہاتھوں برباد ہو ہی رہا ہے مگر علمی اور ادبی برادری کو کم از کم اس نجاستِ نااتفاقی سے آلودہ نہ ہونا چاہئیے تھا مگر اس کا کیا علاج کہ یہ طبقہ بھی اس "حمام" میں "ننگا" ہی نظر آتا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر سخت تکلیف ہوتی ہے کہ تمکین سے رشک، حسد، اور بغض رکھنے والوں کی تعداد بہت کافی ہو گئی ہے بعض تو محض اسلئے تمکین سے بغض رکھتے ہیں کہ انکو اس قدر شہرت کیوں ہو گئی؟

---

[1] خدا کرے ایسا ہی ہو۔ تمکین غفرلہ

اور بعض اس لئے کہ یہ جو عمدہ عمدہ اور لطیف ترین مضامین تمکین کے قلم سے نکلتے ہیں۔ ہمارے نام سے کیوں نہیں چھپتے! یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو لکھے پڑھے ہیں مگر بعض ایسے لوگ بھی جو "اردو کی چوتھی" اور "آمدن سی لفظی" کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جانتے اب تمکین کے خلاف پروپاگنڈا کرنے لگے ہیں۔ گو تمکین کو ان حاسدوں کے پروپاگنڈے کا افسوس ہوتا ہے اور نہ ان کے اسطرح جل جل کر کلا بتوں ہونے کا رنج مگر یہ کس قدر رنج دہ بات ہے کہ وہ "بدوی" جو نہ تو مہذب اور متمدن ہی ہوں اور نہ انہیں "قہوہ خانے" یا "خرذے کی دوکان" کے علاوہ کوئی سوسائٹی ہی ملی ہو جو ایک سطر اردو لکھ سکتے ہوں اور نہ ایک سطر عربی اور فارسی پڑھ سکتے ہوں اور نہ ایک لفظ انگریزی کا سمجھ سکتے ہوں ایک ایسے قابل اور فاضل ادیب اور انشا پرداز سے خواہ مخواہ حسد رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں اگر کوئی دوسرا انشاء پرداز یا پڑھا لکھا شخص تمکین سے محض انکی شہرت اور عزت کی بناء پر رشک و حسد کرتا تو کوئی بات نہ تھی۔ ان "طویل القامتوں" کو معلوم ہونا چاہیے کہ بقول "لنکن"

"تم کچھ لوگوں کو بے وقوف بنا سکتے ہو اور سب لوگوں کو تھوڑے

عرصے کیلئے دہوکا دے سکتے ہو، مگر ہمیشہ سب لوگوں کی آنکھوں میں خاک نہیں ڈال سکتے۔"

کیونکہ علمی اور ادبی حلقے میں اُن حاسدوں کا گذر نہیں اور اگر کسی "یورپ زدہ ڈاکٹریٹ" کی جوتیوں کے طفیل میں گذر ہو بھی گیا تو کون انکی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور ایک ایسے قابل انشاپرداز اور ادیب کے مقابلے میں کچھ کہنے سننے کا موقع دیتا ہے آخر یہ خود ذلیل[1] ہونگے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمکین کے اس مجموعۂ مضامین کی جس پر میں "تقریب" لکھ رہا ہوں خاصی مخالفت ہوگی اور یہ تمام ہنساد ظرافت نگار اور "بدوی" حتی الامکان جد وجہد کرینگے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے "ایمرسن" نے کیا اچھی بات کہی ہے۔

"دوستانہ کوشش یا مخالفانہ جد وجہد کی بناء پر تمام"
"کتابوں کو استقلال نصیب نہیں ہوا ہے بلکہ ان کو"
"شہرت اور دوام انکی مخصوص کشش کی وجہ حاصل ہوئی ہے"

چونکہ "غنچۂ تبسم" میں ایک مخصوص کشش ایک شہرت پانے کی قوت

---

[1] مجھے نہایت افسوس ہو کہ سعیدی صاحب نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا ہے اور پھر اس حصے کے شائع کرانے پر مصر بھی ہیں (تمکین)

اور ایک ادبی وزن موجود ہے اسلئے یہ کتاب مقبول ہوگی اور خوب مقبول ہوگی۔ اور ایک دن وہ آئے گا کہ بقول حضرت احسن مارہروی

"تمکین کی نثر اکبر الہ آبادی کی نظم کی طرح بقائے دوام حاصل کریگی۔"

اور

پہلے پھولیگا یہ غنچہ گلستاں بوستاں ہوکر

عبدالمنعم سعیدی

غازی پورہ۔ گلبرگہ
۱۲؍ اپریل ۱۹۳۱ء

کام کم نام بڑا۔ نقاد

خوش باش دمے کہ زندگانی این است

غنچۂ تبسم

[illegible]

مُندرَجات

		صفحہ			صفحہ
۱	گپ	۱	۱۱	مضمون کیسے لکھتے ہیں	۹۶
۲	میر صاحب	۶	۱۲	ہم اور ہماری عید	۱۰۹
۳	مرزا صاحب	۲۴	۱۳	ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے	۱۲۴
۴	مولوی جی	۳۷	۱۴	جھوٹ	۱۳۴
۵	منشی جی	۴۴	۱۵	جھٹکا	۱۳۹
۶	زن مُرید	۵۱	۱۶	گھبراہٹ	۱۵۵
۷	عطردان	۵۹	۱۷	خواہ مخواہ	۱۶۱
۸	بدحواسی	۶۵	۱۸	شادی سے پہلے	۱۷۳
۹	چارلی چپلن کا تماشا	۷۲	۱۹	خاں صاحب	۱۸۹
۱۰	بُوکھلاہٹ	۷۹	-	-	-

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۵	ترفا	شرفا	۲۹	۱	رمضان شریف	شعبان
۲	۳	طبقہ	تختہ	۳۴	۳	نمدوۃ العلما	ندوۃ العلما
۳	۲	شکشپیر	شکسپیر	〃	۱۳	زوز	زور
〃	۶	بلانگ	بلانک	۳۵	۱۲	لنزیز	لذیز
۴	۱۳	زموزی	رموزی	۴۸	۱۶	زور روز	زور زور
۵	۱۳	جنھوں بے	جنھوں نے	۷۲	۱۱	گولڈن تش	گولڈرش
۱۲	۹	ہواگزرا	ہو گزرا	۷۴	۷	خرانوں	خراٹون
۱۹	۶	روز	زور	۷۷	۱	جدار	گرجدار
〃	۶	سلامت	سلاست	۹۵	۷	افرجانی	نافرمانی
۲۶	۱۱	صاحب بے	صاحب نے	۹۷	۱	سکرٹ	سگرٹ
〃	۱۷	موجودہ	موجود	۱۰۱	۱۴	بلاٹنک	بلاٹنگ
۲۷	۳	ہامونیم	ہارمونیم	۱۱۳	۱۰	ڈاگ	ڈاک

۱۱۷	۲	قلعہ کو جانے	قلعہ جانے
۱۱۸	۴	ستم علی	رستم علی
۱۱۹	۳	ٹھنڈے بانی	ٹھنڈے پانی
〃	۴	کروٹ لی	کروٹ بدلی
〃	۵	اٹھایا	اٹھالیا
〃	۸	گود سے تر پڑا	گود سے اتر پڑا
〃	۱۵	ہی	رہی
〃	〃	آگے بڑھکر	آگے بڑھ کر
〃	〃	بلائین	بلائیں
۱٦۹	۱٦	مں	میں
۱۷۱	٦	بیہ	یہ
۱۷۲	۲	ہمارے	ہماری
۱۲۸	۵	لکشمندت	لکشمیدت
۱۳۳	٦	ممگن	ممکن
〃	۱۳	پہ	بہ
۱۵۳	۱	کسی کھولے	کس کے کھولے
۱۵۵	٦	گرٹ	گزٹ
۱۵۷	۱۷	بگگھی	بگھی
۱۵۹	۱۷	سعد	بعد
۱٦۱	۱	ہی	یہی
۱٦٦	۱۴	لارالی پلانٹ	لارالا پلانٹ
۱۹۰	۱۲	یاند	باندہ
۱۹۱	۱۴	منلاشی کے	منلاشی کہ

گپ

اللہ اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ ہر ایک شریف آدمی کی بیٹھک میں یا دیوان خانہ پر یار دوست جمع ہوتے تھے۔ حقہ پر حقہ تازہ ہوتا سماور پر سماور ختم ہوتا فنجانوں پر فنجانیں چڑھائی جاتیں بیڑے پر بیڑا چبایا جاتا اور گپیں اڑتیں، اور ایک یہ زمانہ بھی ہے کہ لوگوں میں گپ کا مذاق ہی نہیں کہ گپ کیا ہے، بس یہ سمجھ لیا ہے کہ گپ افیونیوں یا مداکوں ہی کی خاص چیز ہے شرفا، اور تعلیم یافتہ طبقہ اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

حضرت! گپ بھی ایک فن ہے فنون لطیفہ میں سے اسکی ابتدا جنت میں حضرت معلم الملکوت نے کی وہی اسکے موجد ہیں دادا آدم سے وہ پہروں گپ بازی کیا کرتے تھے، حضرت آدم جب روئے زمیں پر تشریف لائے تو ان کے پاس دل بہلانے کی یہی ایک چیز تھی۔ اماں حوا اور دادا آدم ملکر اسی سے دل خوش کرتے تھے جوں جوں زمانہ بدلتا گیا تمدن و تہذیب میں

ترقی ہوتی گئی گپ نے بھی ترقی کی اور اعلیٰ مدارج حاصل کئے آج یہ ایک مستقل فن ہے اسکے جاننے والے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

یونان میں بڑے بڑے گپ باز گزرے ہیں انہیں بزرگوں نے تو طبقہ الٹوادیا، عرب میں بھی اس فن کے آئمہ قبل از جاہلیت اور بعد از جاہلیت گذرے ہیں علامہ واقدی جنکی تاریخ اور حدیثیں مشہور ہیں اس فن کے امام تھے انہوں نے نہایت سنجیدگی سے گپیں جمع کیں اور شہرت دی مگر یار لوگوں نے خواہ مخواہ انکی روایتوں کی تکذیب کی ایسے ثقہ امام گپ کو کاذب غیر ثقہ قرار دیکر انکی گپوں (حدیثوں) کو جھوٹی ٹھیرایا، ایک اور بزرگ بھی قدرت سے بھی دل و دماغ مانگ لائے تھے، چونکہ علامۂ واقدی کا انجام پیش نظر تھا۔ اس لئے انہوں نے "الف لیلہ" لکھی یہ بھی مجموعہ ہے گپوں کا جس کو اس قدر شہرت ہوئی کہ تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہوگیا، عجم میں بھی اس فن کے بڑے بڑے امام ہوئے دیکھئے "شاہ نامہ" کتنی بڑی گپ ہے جو ابتک چلی آرہی ہے سکندر نامہ (جو امتحان منشی میں تاجنگ زنگیاں پڑھایا جاتا تھا) بھی ایک گپ ہی ہے، چچا سعدی نے بھی گلستاں میں نہایت سلیقہ سے گپیں لکھدیں جن کو پڑھ کر لوگ ابتک چکر میں ہیں اکثروں کو یہ خیال ہے کہ وہ ہندوستان آئے تھے، حالانکہ انہوں نے ایک گپ ٹھونکدی۔

یورپ میں بھی سلیقہ شعار گپ باز بہت ہوئے میاں رینا لڈز،

اس فن میں طاق تھے۔ انکی جس قدر تصانیف ہیں وہ بہت سنجیدہ یا غیر سنجیدہ گپ کی تعریف میں داخل ہیں بھائی شکسپیر نے بھی اس فن میں کمال کیا ہے اناطول فرانس، وکیٹر ہیوگو، گیٹے، برناڈ شا بڑے بڑے گپی ہیں ان میں سے دو نے تو "نوبل انعام" بھی اسی گپ بازی کے صلہ میں پایا، آرتھر کینن ڈائل بھی بڑے حضرت ہیں۔ انہوں نے ایک طرف روحانیت میں گپ بازی کی اور دوسری طرف شرلک ہومز جیسی گپ چھوڑی، مارس لی بلانگ کو خدا سلامت رکھے انکی گپیں لال برادرز کے طفیل میں لالہ تیرتھ رام جی ترجمہ کر رہے ہیں۔ ان کی جیتی جاگتی گپ آرسین لوپن ہے، یہ ادبا کا طبقہ تھا۔ علما اور ماہران فنون بھی اس لطیف شئے کو نہیں بھولتے میاں ڈارون نے ایسی گپ دی کہ آج تک لوگ چکرا رہے ہیں بعض بزرگ معمل، یا رصدگاہ میں بیٹھے بیٹھے نئی نئی گپیں اڑا دیتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ آیندہ سو سال میں انسان چھ انچ کا رہ جائے گا تو کوئی چوبیس گھنٹے میں دس منٹ کی نیند کافی ہونے کا اعلان کرتا ہے کوئی ستارو کے ٹکرانے سے آدھی دنیا کی تباہی کی خبر دیتا ہے۔ تو کوئی عالمگیر جنگ کا اعلان کرتا ہے، بہرحال ہر سنجیدہ شخص مصروف گپ بازی ہے۔ خدا رکھے ہندوستان جنت نشان کو یہاں بھی یہ فن شریف بہت ترقی کر چکا ہے، بعض گپیں سینکڑوں سال سے چلی آتی ہیں "کلیلہ و دمنہ" والی گپ کیسی ہے "کوک شاستر" یا "کوکا پنڈت" والی گپ سے عقلمند تا شرابتک فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر یہ

ہندوستان میں اشاعت گپ ... ہوئی تو یہ اس گپ کی بدولت پیدا

خواجہ صاحب نے بوستان خیال کے ... ناول گپ بازی کی جو ایک مشغلہ ہے

ہندوستان کے بڑے بڑے تاریخی واقعات بھی ان گپ شپوں کی بدولت ہوئے

دہلی کی بچی کھچی سلطنت الٹ گئی ... کارتوسوں کو چربی لگانے کی گپ ... کا غدر

بھی ایک معمولی گپ کا نتیجہ تھا۔ جلیانوالہ باغ بھی ایک گپ کے طفیل مشہور ہوا

"کلکتہ کے کالے گھر" والی گپ تو آپ نے تاریخ میں دیکھی ہوگی۔ مہاتما جی

کی سوراج والی گپ کا کیسا زور و شور رہا۔ مولانا محمد علی کی ہندو مسلم اتحاد کی

گپ کیسا کام کر رہی ہے۔ حسن نظامی کی ایک چھوٹی سی "پان اسلام ازم" والی

گپ کی وجہ سے مولانا محمد علی کیسے بگڑے۔ خواجہ صاحب کی تبلیغ والی گپ کتنی

کامیاب گپ ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی گپ باز ہیں۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور

نے گپ میں شاعری کی اور "نوبل انعام" ہتھیا لیا۔ منشی پریم چند کی افسانہ نما گپیں

اور منشی سدرشن کی گپیں۔ اور نیاز فتح پوری کی مختصر اور مفید گپیں حوادث اور گلابی

اردو کی شکل میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا نام کہ حاجی بلغ العلا کی گپ بازی

ہمدرد کی جان تھی۔

اخباری دنیا میں سب سے سنجیدہ گپ باز رائٹر ایجنسی ہے جو نت نئی

گپیں مشہور کرتی ہے۔ اسکے بعد پنجاب پریس جو آئے دن گپوں کے ذریعہ ہندو مسلم

جذبات کو منتقل کرتا رہتا ہے۔

دکن میں بھی یہ مذاق قدیم سے ہے "چہار بدات و مہیار" والی گپ سب سے پہلے دکن ہی سے نکل کر ہندوستان تک پہونچی۔ میاں منصور کی انا الحق بھی یہیں کی پیداوار ہے۔ تغلق کے مظالم کی گپ بھی یہیں سے اڑی اور امیران صدہ نے یہیں بغاوت کی جسکی وجہ سلطنت بہمنیہ کی بنیا پڑی اور آخر میں انہیں گپوں نے اسے توڑ کر پانچ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کیں تا تا شاہ کے رنگ رلیاں بھی گپ تھیں عالمگیر کے طیش سے سنجیدہ صورت اختیار کرلیں۔ مہاراجہ چندولال کے زمانہ کی گپیں آپ نے سنی ہونگی۔

اب بھی بفضلہ تعالےٰ دکن میں گپ باز موجود ہیں "مرزا الم نشرح" ایک فاضل گپی ہیں آپ کی دو گپیں مجلہ عثمانیہ کے پہلے اور دوسرے نمبروں میں بھی طبع ہو چکیں ہیں، تیسری گپ دہلی کے مشاعرہ کے عنوان سے اردو میں چھپی ہے اب تو ان گپوں کا مجموعہ "مضامین فرحت"[1] کے نام سے کراؤن مارک سیاہی میں چھپ چکا ہے جس پر ہمارے دوست کی ایک تاریخ بھی کندہ ہے، جنھوں نے "برس" کا قافیہ "ہنس" لکھ مارا یہ بھی ایک گپ ہے، اب ہمارا ارادہ بھی نظام گزٹ میں ایک مستقل سلسلہ گپ شروع کرنے کا ہے مگر یہ گپ کچھ زیادہ سنجیدہ نہ ہوگی یعنی ان گپوں سے فسادِ گلبرگہ کی طرح کوئی ہنگامہ نہ ہوگا، صرف تھوڑی دیر قہقہہ بازی اور پھر خاموشی، یہ صرف تمہید ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

---

[1] اب تو حصہ دوم بھی طبع ہوگیا۔ حصہ سوم، چہارم، دیکھیے

میر صاحب

یوں تو میر صاحب سے، ہزاروں آدمی واقف ہیں، مگر ان کا نام شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ میر صاحب ہر ایک کی زبان پر چڑھا ہوا ہے کم از کم ہم نے تو انہیں کسی دوسرے نام سے مخاطب کئے جاتے نہیں سنا۔ سبھی میر صاحب کہتے ہیں۔

میر صاحب کے قویٰ نہ جانے کیسے ہیں کہ نہ تو وہ گھٹتے ہیں نہ بڑھتے ہیں وہی سفید ہرک کی شیروانی کپڑے کی گنڈیاں ٹکی ہوئی۔ ہرک کا پاجامہ ٹخنوں سے اونچا سفید ململ کا شملہ الٹا سیدھا لپٹا ہوا کندھے پر صوفیانہ چارخانی رومال پاؤں میں مارکٹ کا نعل لگا ہوا سُرخ چڑھاؤ۔ جیب میں سیاہ مقوے کی ناس کی ڈبی۔ سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں آخری چہار شنبہ کا چھلہ اور الٹے ہاتھ کی چھنگلیا میں مصر آ شیروانی چھاتے اور مونڈوں پر پان کے سُرخ سرخ اور ناس کے سیاہ سیاہ دھبوں سے مزین، اس حال میں ہم میر صاحب کو آج کل سے نہیں اٹھارہ انیس سال سے دیکھ رہے ہیں۔ بھرا بھرا جسم متوسط قد سخت سخت ہاتھ پاؤں سر گھٹا ہوا

گھنی گرد ڈاڑھی جس میں بعض بعض سفید بال بھی ہیں، مونچھیں بالکل کتری ہوئی۔ کان پر لانبے لانبے بال، خط صاف بنا ہوا، ہاتھ میں "تنبیہ الغافلین" یعنے موٹا سا ڈنڈا جس کی شام لوہار سے ہر دوسرے مہینے میں بنوائی جاتی ہے۔

چونکہ میر صاحب، ہمارے بزرگوں کے ملنے والے ہیں، اسلئے ہم پر بہت مہربان رہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ میں بھی پُرخلوص بزرگ والد مرحوم کے انتقال کی جب اطلاع ملی تو ہمیں ڈھونڈنا شروع کیا دو دفعہ گھر پر بھی آئے مگر ہم نہ تھے ایک دفعہ ہم گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ حضرت مل گئے، بس لپٹ ہی تو گئے دیر تک والد مرحوم کو یاد کرکے روتے رہے اِدہر اُدہر کی باتیں کیں۔ سڑک پر کھڑے ہوئے نہایت ہی بے تکلفی سے گفتگو کرتے رہے ہم نے کہا "تقصیر چلیئے، تھوڑی دیر تشریف تو رکھئے" میر صاحب تیار ہی تھے دیوان خانہ میں آکر بیٹھ گئے، ہماری ملازمت، منصب، والد کی علالت، موت، تجہیز و تکفین، بچوں کی تعلیم، وغیرہ وغیرہ کے متعلق نہایت ہی سنجیدگی سے جرح کرتے رہے، ہم نے اس غیر دلچسپ بحث کو ختم کرنے کیلئے حیدرآباد کے محرّم کا بے تکا ذکر کر دیا، بس میر صاحب کی آنکھیں بھر آئیں ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے۔

"میاں[1] آج کل محرّم میں رکھا ہی کیا ہے تم کو شاید آخری زمانہ کی کچھ باتیں

---

[1] میر صاحب کی زبان کے ذمہ دار ہم نہیں ہم نے نقل کی ہے انہوں نے جو کچھ کہا ہمنے لکھ دیا محاورہ زبان وغیرہ کی نسبت اعتراض ہو تو کرڑے صاحب کی گلی میں میر صاحب کو ڈھونڈ کر انسے گفتگو کر لیجئے۔ (تمکین)

یاد ہوں گی کیسی دلچسپی رہتی تھی کیا زمانہ تھا واللہ وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجے پر سانپ ہی تو لوٹ جاتا ہے ہائے ادھر چاند نظر آیا اور ادھر علم استادہ ہوگئے۔ گھر گھر علم گلی گلی الاوہ کوچہ کوچہ آبدارخانہ وہ چہل پہل وہ بھاگ دوڑ اب کہاں اللہ اللہ لنگر کے کیا کیا انتظامات ہوتے تھے مہینوں پہلے سے نکلے کرائے پر لیے جاتے فرش وغیرہ کا انتظام ہوتا۔ اور لوگ منہ اندھیرے آکر بیٹھ رہتے گیارہ بارہ بجے مشعل لگتی رات گئے (۱۲) بجے تک سلسلہ جاری رہتا خدا جنت نصیب فرمائے۔ حضور جنت آشیاں کو پنج محلہ پر رونق افروز رہتے کوتوالی کا باضابطہ انتظام رہتا تھا دور دور سے لوگ صرف لنگر دیکھنے آتے تھے۔ واللہ حبیب اکبر جنگ کوتوال کا ہاتھی سامنے سے گذرتا تو اچھے اچھے سورماؤں کے گھگھی پڑ جاتی وہ گراں ڈیل کوہ پیکر ہاتھی وہ انکی خاص عماری اور اس پر اکبر جنگ کا خاص انداز میں بیٹھنا ہاتھی کے دو طرف دو جلاد ننگے (تیغے) ہاتھوں میں لئے سرخ سرخ آنکھیں چمکاتے ہوئے چلتے تھے آہ ایک سے ایک بارعب ایک سے ایک بانکا جوان مندوزی جمعدار بڑ کمر والے برق جنگ، سلطان نواز جنگ، اور دوسرے بڑے بڑے جمعدار، کمندان، رئیس کیسی شان سے نکلتے وہ تمہارے محلہ والے نواب عباس علیخاں! ہائے لنگر کیا ہوتا تھا شہر کے بانکوں ترچھوں کی نمائش ہوتی تھی نمائش اجی معمولی پیادوں میں تک ایک بانکپن تھا، اونچی چولی کا انگرکھا کمر بندھی ہوئی طبنچہ، کٹار، زیب کمر ہاتھ میں عباسی سر پر پگڑی جب

تنتے ہوئے چلتے تو زمین لرزنے لگتی زمین! اور پھر افسر سے لیکر سپاہی تک بات بات پر کٹ مرنے تیار! ایک دفعہ سلطان نواز جنگ کا ہاتھی جس پر بیچے سوار تھے شاید روک دیا گیا یا واپس کر دیا گیا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جمعدار نے جمعیت تیار کرائی۔ اجی وہ خون خرابی ہوتی کہ سارا شہر لٹ جاتا مگر خدا جنت نصیب کرے مرحوم سرکار نے روک دیا۔ تمہارے والد بھی تو اکثر سلطان نواز جنگ کے پاس رہتے تھے۔ ایک دفعہ وہ اور لڑکوں کے ساتھ ہاتھی پر نکلے۔ ظالم ایسا مست تھا کہ بس بگڑ کھڑا ہوا چوک سے سیدھا نکلا تو پرانا پل پار ہو کر کاروان میں دم لیا۔ ہم بھی حسینی علم کے پاس کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے خیر یہ ہوئی کہ فیلبان آدمی سمجھدار تھا آہستہ آہستہ روک کر واپس لایا ورنہ غضب ہو جاتا۔ تمہارے والد پورا قصہ تفصیل سے بیان کرتے تھے۔ میاں اس زمانہ میں کیسے کیسے رنگ تھے یہ جو تم تھیٹر تھیٹر کرکے رُوتے ہو۔ یہ اس کے سامنے کوئی چیز نہ تھی۔ نتھو بیگ کا رنگ، طیب علی کا رنگ ان کا رنگ اُن کا رنگ کیسے کیسے استاد تھے، ہم نے الفریڈ کے ناٹک بھی دیکھے اور کھٹاؤ کے بھی۔ حج کو جاتے ہوئے بمبئی میں ہم نے غافل مسافر کا کھیل بھی دیکھا مگر میاں! وہ بات کہاں ہائے ظالم غضب کرتے تھے غضب! کیسی کیسی نقلیں اتارتے تھے کیسے کیسے سوانگ لاتے تھے وہ ناچنے والے وہ گانے والے اب کہاں اجی چوبیس چوبیس گھنٹے ایک ہی نقل ہوتی تھی بیچ محلہ مبارک پر حضور رونق افروز رہتے نیچے رنگ ہوتا دو دو دن چار چار دن مسلسل ایک رنگ کھڑا

رہتا۔ ہائے میں تم کو کس طرح سمجھاؤں تم نے آخری رنگ تو دیکھے ہیں اسوقت وہ بات نہ تھی۔ کیسے دل چلے لوگ تھے۔ جس کو چاہتے بنا دیتے۔ جسکی چاہتے ہنسی اڑاتے محسن الملک، نذیر احمد، حسن بلگرامی تمہارے نانا یوسف الدین، مہدی بلگرامی وغیرہ تک کو نہ چھوڑا۔ مولوی یوسف الدین اس زمانہ میں فراش مشہور ہو گئے تھے ایک دفعہ سرِ بازار انکی نقل اتار دی وہ بیٹھے دیکھا کئے دانت پیس کر رہ گئے، کیا کرتے مجبور تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھ سے کون بچا ہے جس کو چاہتے بدنام کر دیتے مگر بھئی تھے باکمال لوگ۔ میاں! وہ نعل صاحب کی سواری کس دھوم سے نکلتی تھی سارا راستہ بھر جاتا تھا جدھر دیکھو ڈیوٹیاں (مشعلیں) ہر طرف "دولہا یا علیؑ" کی دھوم تل دھرنے جگہ نہ ملتی تھی کھوے سے کھوا ملکہ ناک سے ناک رگڑے کھاتی تھی، وہ دھوم دھام اب خواب و خیال ہی ہو گئی۔ نذی کا میلہ شہادت کے روز کیسے دھوم سے ہوتا تھا علم کا جلوس کتنا شاندار ہوتا تھا۔ بہشتی پانی چھڑکتے ہوئے جاتے تھے، ملنی مشکیں چھڑواتے رہتے خوش اعتقاد سڑک پر عود گار ڈھتے جاتے سبیل ہر جگہ لگی رہتی پانی کے بجائے دودھ کے شربت پلائے جاتے، ہائے وہ ماہی مراتب وہ علم مبارک کا ہاتھی آنسو بہاتے ہوئے گردن ڈالے کس غمگینی کیساتھ چلتا تھا علم پر ڈہٹیوں کی کثرت، عود بتیوں، وغیرہ کی بوچھار، بیچارہ علمبردار اور ماہی تو ہو ہی جاتا کیسے کیسے تعزیے ساتھ ہوتے واللہ کس کمال سے بنائے جاتے تھے۔ نذی پر دیکھنے کی دھوم ہوتی تھی، حضور پرانی حویلی پر سے ڈہٹی

مرحمت فرماتے تھے بعض دفعہ تو ندی پر بھی رونق افروز ہو جاتے تھے، ندی کا میلہ تو اب بھی ہوتا ہے۔ مگر وہ بات کہاں؟

اس زمانہ میں کیسے کیسے لوگ تھے سدی مبروک استاد چنگاری، یاقوت عیسیٰ، بنگش، کیسے کیسے پھکیت لکڑی باز تھے حضور تو مبروک کی پھیک پہروں ملاحظہ فرماتے، اشرفیوں کے توڑوں کے توڑے مرحمت فرماتے!

محرم کے سوانگ تو بس نام کو رہ گئے اب شیر تو نظر ہی نہیں آتے، کیسے کیسے جوان شیر بنتے تھے اچی چپل سینڈ (ناگ پھنی) کی بھری بنڈی میں شیر سوتا ہوا جاتا تھا بعض شیروں کو تو ہم نے اپنی آنکھوں سے بکرے کا گلا چیر کر خون پیتے دیکھا ہے! وہ ہوا ہی بدل گئی۔ شیر، ریچھ، ایک ڈھمک، کتنے سوانگ ہوتے تھے بے گنتی! مال والوں کی پتلیاں، مہاراجہ کی ڈیوڑھی کی پتلیاں ابن صاحب کا آبدارخانہ حضرت عباس کی درگاہ، بی بی کا الاوہ، بادشاہی عاشور خانہ، سینی علم، یہ دیکھنے کی چیزیں ہوتی تھیں، ہم لوگ دو دو تین تین رات تک ان مقامات کی سیر کرتے تھے، مگر جی نہ بھرتا تھا۔

مجلسیں کتنی دھوم سے ہوتی تھیں، رشید آتے تھے، دولہا آتے تھے میاں منجھو بھی رہتے وہ بھی کیا سماں تھا؟ سارے شہر میں ٹکڑیاں ٹولیاں تھیں ایک محلہ کی ٹکڑی دوسرے محلہ کے خلاف، وہ لکڑی چلتی وہ سر پھٹول ہوتا کہ الامان الحفیظ، خوب لکڑی چلتی تلوار تک نوبت پہونچتی، سال بھر کی عداوت

محرم میں نکل جاتی تھی، سینکڑوں مرتے ہزاروں ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک کھو کر بُرے حالوں جیتے، بچوں میں تک یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اپنے محلہ میں کوئی دوسرے محلہ کا لڑکا آجاتا تو اس سے نالہ بھرواتے"۔ میاں وہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں، کسی نئے آدمی سے کہو تو سن کر ہنسنے لگا! نہ اب وہ جوش ہے اور نہ وہ دل وہ دماغ ہی نہیں وہ چونچلا ہی نہ رہا۔ دکھنی پٹھان مشہور تھے کیسے آن بان والے بات بات پر کٹ مرنے تیار، کوئی سامنے سے تنتنا ہوا نکل تو جائے بس وہیں ڈھیر کر دیا۔ بڑے میر صاحب اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما چکے تھے کہ ایک روز پانچ بجے ایک خان صاحب اپنے گھر کے بالاخانے پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے سے ایک شامت زدہ مونچھیں چڑھاتا ہو گزرا، بس خانصاحب آپے سے باہر ہو گئے تلوار سنبھال کر بالاخانے سے کو دہی تو پڑے اور پھر اس بانکے نوجوان کو مخاطب کر کے فرمایا میاں ہم بھی سپاہی ہیں۔ بنئے بقال نہیں تم نے کیا سمجھ کر ہمارے آگے مونچھیں چڑھائیں۔ وہ بیچارہ حیران ہو کر سب کچھ سنتا رہا آخر وہ بھی سپاہی تھا کہنے لگا۔ حضرت میں نے آپ کو دیکھ کر مونچھیں نہیں چڑھائی تھیں۔ مگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میں اب چڑھاتا ہوں آپنے سمجھ کیا رکھا ہے۔ ہم بھی تو سپاہی ہیں کوئی چمار نہیں، بس خانصاحب کا بُرا حال ہو گیا۔ اس نوجوان کی گردن پکڑ کر اینسا جھنجھوڑا کہ دس ہی منٹ میں غریب کا دم نکل گیا آپنے غریب کی نعش کو ٹھکرا کر فرمایا دیکھا مردوں کے آگے مونچھیں چڑھانے کا مزا۔

ایسے لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں انہیں کی نسل اب بھی باقی ہے مگر پڑھ لکھکر سب بزدل ہو گئے ہاتھ اٹھاتے ہیں تو ضابطہ دیوانی کا خیال رکھ کر پاؤں بڑھاتے ہیں تو فوجداری کے دفعات کو دیکھکر گھر سے نکلنے سے پہلے سوچ لیتے ہیں کہ ان کا باہر نکلنا قابلِ دست اندازی پولس تو نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے سے آدمی ناکارہ بزدل ضرور ہو جاتا ہے، یہی دیکھو نا تمہارے دادا ناظم دیوانی بلدہ تھے انہیں حکم ہوا کہ امتحان دیں، یہ حکم بہت ناگوار گذرا کچھ سوچکر خاموش ہو گئے چند روز کے بعد امتحان دیا اور کامیاب ہوے کامیابی کی اطلاع ملتے ہی استعفیٰ دیدیا فرماتے تھے کہ ہم نے عدالت کا کام کرتے کرتے عمر گذاری اب ہم سے امتحان کو کہا جا رہا ہے گویا ہم کچھ جانتے نہیں ہمارا ارادہ تو حکم ملتے ہی ملازمت چھوڑ دینے کا تھا مگر یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ نہ کہیں کہ امتحان میں ناکامیاب رہنے کے خوف سے ملازمت چھوڑ دی، ہم نے امتحان دیا اور پھر استعفیٰ!" اب دیکھو انہیں نواب سعادت علیخاں بہادر کے صاحبزادے تمہارے والد تھے انہوں نے کئی ایک امتحان دیئے جس کے باپ نے امتحان کو ذلت خیال کیا تھا، اس کا بیٹا عزت تصور کرنے لگا۔ اب تم ہو کہ تمہیں بھی امتحانوں کی دھن سوار ہے کہو تم لوگ پڑھ کر بزدل ہو گئے یا نہیں، پرانے لوگ، قرآن شریف، چند حدیثیں چند تفسیریں کچھ منطق کی عربی کتابیں تھوڑی سی فارسی پڑھ لیتے تھے اور بس یہی وجہ تھی جو وہ عزت، خودداری، وقار تمکنت، وضع داری پر جان تک دیدینے تیار ہو جاتے

تم لوگ فلسفہ، سائنس، حساب، معاشیات، سیاسیات، الہیات، بلییات،
کیا اور کیا پڑھکر تمام چیزیں کھو بیٹھے ہو، گالی سنتے ہو تو گالی کے فلسفہ پر بحث کرنے
لگتے ہو۔ عزت کا خیال نہیں کرتے، مار پڑتی ہے تو سائنس کے نقطۂ نظر سے اس کو
دیکھتے ہو اسکی علت غائی سمجھنے لگتے ہو، خودداری کو نزدیک آنے نہیں دیتے۔
اسی طرح تم لوگوں نے ساری چیزوں کو بھلا دیا ہے، مذہب کا تو نام ہی نام
رہ گیا۔ عید کی نماز بھی تمہیں ناگوار ہے، خدا کے احکام پر ہنسنا، رسول کے احکام کا
مضحکہ اڑانا آئمہ کے اقوال پر قہقہہ لگانا، بزرگوں کے افعال کو بے وقوفی ٹھہرانا تم لوگوں کی
عادت ہو گئی ہے۔ لے دیکھئے تمہارے پاس مذہب صرف ترکی ٹوپی کی حد تک رہ گیا ہے
وہ بھی جاڑے اور برسات میں کیونکہ گرما میں تو تم لوگ کوٹ پتلون کے ساتھ دھوپ
کی انگریزی ٹوپی استعمال کرتے ہو اس کے بعد البتہ بعض بعض وقت ترکی ٹوپی تم
لوگوں کے سر پر نظر آتی ہے۔ ملک، قوم، وطن، جیسے ثقیل اور بے معنی الفاظ تم لوگوں کا
تکیہ کلام ہیں، ملک کیلئے ایک پیسہ جیب سے نہ نکلیگا، قوم کیلئے گھر سے چار مینار تک
جانا نہ ہوگا۔ وطن کیلئے ناخن کٹوانے کے بھی روادار نہیں۔ مذہب سے اسقدر ہمدردی
رہ گئی ہے کہ بس شریف گھرانے کی بیواؤں کا نکاح ثانی کرانے اور پردہ اٹھا کر
لوگوں کی بہو بیٹیوں کو بے پردہ بنانے کی فکر میں رہتے ہو! ہائے میاں بُرا نہ ماننا
دل جلتا کلیجے میں آگ لگجاتی ہے، خون کھولنے لگتا ہے، اُف زمانہ دیکھتے دیکھتے
کیسا بدل گیا پہلے کے لوگ اپنے بزرگوں سے ملنے والوں یا اپنے سے بڑی عمر والوں کا

اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کے آگے کھانستے کھنکارتے تک نہ تھے ہاتھ باندھے یا
دو زانو مودب بیٹھا کرتے تھے اب تم ہی دیکھو میرے سامنے تم کسقدر بے تکلفی
سے بیٹھے ہوئے ہو سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہو ہائے ادب قاعدہ، تہذیب تو ایک کو
اٹھ گئی۔ اس کے بجائے بے حیائی کے پردے لوگوں کی آنکھوں پر پڑ گئے عینک کر
عبرت!! ہم پرسوں شیخ جی کے پاس سکندر آباد چلے گئے ان کہنے ہم سے قصور ہو گیا
آج ایک مشہور کھیل ہے ہم نے کہا جہاں اتنے شیطانی کھیل اور اپنا راستہ لیا ہمکو
اور سبھی ہم بھی ان کے ساتھ وہاں کے فتح میدان ہیں تمہارے زمانہ کے کھیل کیا
تل دھرنے جگہ نہ تھی ہم نے گھس پٹ کر آخر پہلو ہو جائیں تو سینکڑوں کو بھگا دیں،
کیا ہیں کہ دو طرف تین تین پتلی پتلی کھونٹیاں ہوں کو اس فن کی تعلیم دیجاتی تھی مگر
ہیں ایک طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہے ان کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہے ٹینس!
اور دوسری طرف سے ایک چھوٹے سے خاکی قمیص پہنے سر پر انگریزی ٹوپی اوڑھے
دوڑ شروع ہوتی ہے ادھر سے مدرسہ کے بچے میلے ٹھیلے عرس جاترا میں اکثر
ہیں جسے دیکھ کر لوگ چیختے چلا یہ اسکاؤٹ ہیں چاہے اسکاؤنٹ ہوں یا اسکے
ہیں یہ بھی کوئی کھیل ہے کھیل ہم نے پان چباتے ہوئے سگریٹ جلا کر تماش بینی
کھیلی ہے، تلوار پھینکی ہے لکڑی چلائی بعضوں کے ہاتھ میں ان کے قد سے اونچا
چیر کی بلہ۔ لونڈ پاٹ، جھاڑ بند رہا" بد اتنا تک جانتے نہیں بھلا لکڑی کیا چلائینگے؟
ہوتے تھے۔ لونڈ پاٹ میں ہمارے آوارہ بنانے کی پہلی سیڑھی ہے والدین میلے

ہمارا مقابلہ کوئی نہ کرتا تھا۔ پتلے سے پتلے درخت کی چوٹی پر پہونچ جاتے تھے،
کیا تھی ایسا کھیلا کہ سب لوگ مان گئے اجی آدھ گھنٹہ پانی میں ڈوبے رہتے تھے
لگتے تال میں چھپتا تو اسے بھی نکال لاتے تھے واللہ ہم نے کیا کیا نہیں کیا مگر ایسے
دیکھتے کھیل ہم نے نہیں کھیلے۔ شطرنج، چوسر، پچیسی، ڈومنا، گنجفہ، تاش، داما،
اسی طرح ہم نے کھیلے ہیں تمہارے والد کے ماموں جیلانی صاحب مرحوم مشہور
رہ گیا۔ عید کی نماز تھی تھے دالان میں بساط بچھی رہتی مخالف چال چلتا آپ اندر
مضحکہ اڑانا آئمہ کے اقوال پڑھ پڑھ کہتے رہتے اور پھر تین چار چال میں مات ہو جاتی تھی
عادت ہو گئی ہے۔ لے دیکھئے تمہارے نہیں کئی بار مات دی ہے۔ سید صاحب کی گلی میں
وہ بھی جاڑے اور برسات میں کیونکہ کرامی کی دھوم تھی ایک مرتبہ ہم نے ان سے بھی
کی انگریزی ٹوپی استعمال کرتے ہو اس کے رے پاس آکر کھیلا کرتے تھے۔ بہر حال دنیا کا
لوگوں کے سر پر نظر آتی ہے۔ ملک، قوم، وطن ہے تھے کہ ان سے فائدہ بھی پہونچتا تھا
تکیہ کلام میں، ملک کیلئے ایک پیسہ جیب سے نہ نکلیگا نگر کے پہاڑوں میں کوئی بزرگ
جانا نہ ہوگا۔ وطن کیلئے ناخن کٹوانے کے بھی روادار ان سے تنہا تھے، واپسی میں شام ہو گئی
رہ گئی ہے کہ بس شریف گھرانے کی بیواؤں کا نکاح لہ چار ڈھاٹا بند چور لاٹھی لکڑیاں
لوگوں کی بہو بیٹیوں کو بے پردہ بنانے کی فکر میں زمانہ میں ہم ہاتھ میں لکڑی بھی نہیں
دل جلتا کلیجے میں آگ لگ جاتی ہے، خون کھولنے لگتا ہے انگرکھے کے جیب سے چار موٹے
کیسا بدل گیا پہلے کے لوگ اپنے بزرگوں سے میں باندھ لئے اور رومال کو بل دیکر مقابلے

مقابلہ کیلئے تیار ہو گئے چار و ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کیا ہم نے رومال ہلانا شروع کیا پہلے ہی مار میں ایک چور کا گھٹنا بیکار کر دیا وہ لنگا گر کر اپنے دوسرے مار میں دوسرے کے دونوں ہاتھ پہونچوں سے اتار دیئے وہ غریب تو فرار ہو گیا ایک کو ہم نے پیٹھ پر ایسی ضرب لگائی کہ زمین پر لوٹنے لگا چوتھے نے لکڑی پھینک کر ہمارے پاؤں پکڑ لئے کہنے لگا میر صاحب خدا کیلئے معاف فرمائیے ہم سے قصور ہو گیا ہم نے عاجز کو مارنا خلافِ انسانیت سمجھ کر اسے چھوڑ دیا اور اپنا راستہ لیا ہمکو اِن کھیلوں سے ایسے ایسے فائدے پہونچے یہ تمہارے زمانہ کے کھیل کیا فائدہ دیں گے ؟ ابھی ہم لکڑی لیکر کھڑے ہو جائیں تو سینکڑوں کو بھگا دیں، کھیل کے کھیل ہنر کے ہنر ہیں، پہلے شریفوں کو اس فن کی تعلیم دیجاتی تھی مگر ہائے اب تو شریفوں کی اولاد عورتوں کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہے ٹینس!

وہ خاکی چڈیاں (نکر) اور خاکی قمیص پہنے سر پر انگریزی ٹوپی اوڑھے کمر میں رسی لٹکائے چھوٹے چھوٹے مدرسہ کے بچے میلے ٹھیلے عرس جاترا میں اکثر نظر آتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اسکاؤٹ ہیں چاہے اسکاونٹ ہوں یا اسکے ہونٹ ہوں مگر کس کام کے۔ سوائے پان چباتے ہوئے سگریٹ جلا کر تماش بینی کرنے کے یہ لڑکے کر ہی کیا سکتے ہیں بعضوں کے ہاتھ میں ان کے قد سے اونچا بانس بھی ہوتا ہے۔ بیچارے "بنیرا" بد انا تک جانتے نہیں بھلا لکڑی کیا چلائینگے؟ اور پھر وہ بھی بانس، یہ لڑکوں کو آوارہ بنانے کی پہلی سیڑھی ہے والدین میلے

ٹھیلے میں جانے کی خوشی سے اجازت دیتے ہیں مدرسے سے رخصت ملجاتی ہے نگرانی کرنیوالا کوئی ہوتا نہیں، چلو جو جی میں آیا کیا، کیا میاں اسی منہ پر تہذیب سکھانے، مہذب بنانے کا وعدہ ہے۔ تہذیب اسی طرح سکھائی جاتی ہے اگلا پچھلا حصہ کھلا ہے اور چلے جا رہے ہیں۔ مٹکتے تھرکتے، گورا گورا رنگ بھرا بھرا جسم، پھر چست لباس، ستر عورت (گھٹنے) نظر آتے ہوئے انہیں دیکھکر بے تحاشا جی میں آتا ہے کہ یہ کہدیں۔

اے تماشاگاہ عالم روئے تو   تو چرا بہرِ تماشا می روی

اور پھر دل لگی یہ کہ بیچارے دوسروں کی مدد کرنے یا دوسرے معنی میں خود تماشا دیکھنے جاتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ بقول شخصے

تماشہ بن گئے خود ہی تماشا دیکھنے والے

وہ خود تماشا بن جاتے ہیں، یہیں سے ان کے اخلاق بگڑنے لگتے ہیں۔ علتِ شنائخاں پیدا ہونے لگتی ہے کیا جدید تہذیب اسی کا نام ہے پرانی روش کو چھوڑ کر تم لوگوں نے جو ترقی کی وہ یہی ہے اپنی اولاد کو اسیطرح تربیت کرتے ہیں؟ ہائے خدا کی قسم!

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی   کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

لاحول ولا کدھر محرم کہاں وہ اکھاڑے اور کدھر یہ تمہاری جدید تہذیب میں بھی کہاں سے کہاں پہونچ گیا بھائی بات یہ ہے افکار نے دماغ کو

ضعیف کر دیا ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ ہمارے حافظہ کی دھوم تھی، کروڑوں شعر یاد تھے۔ بیت بازی میں ہمارے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا ایسے شعر جنکے آخر میں د، ڈ، ر، س، ش، وغیرہ ہوں ہمیں ہزاروں یاد تھے ذوقؔ۔ سوداؔ میرؔ، انشاؔ، نصیرؔ، مومنؔ، کی غزلیں، نوکِ زباں تھیں! بات یہ ہے کہ وہ صحبتیں بھی ایسی ہی تھیں، غلام حسین داد مرحوم، کیفی مرحوم، تمہارے والد تجلی مرحوم مست، مےکش، تراب علی روز، استادِ داغ، ترکی وغیرہ کا مجمع تھا رات دن انہیں لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، مرحوم داد کی بذلہ سنجی، کیفی کی لطیفہ گوئی، تجلی کی حاضر جوابی، مست کا چوچلا، مےکش کی رندی، زور کی تاریخیں، استادِ داغ کا روزمرہ، ترکی کا پھکڑپن قابل دید تھا۔ ہائے کیا صحبت تھی، کیفی کا یہ حال تھا کہ منٹ بھر نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا، چلتے چلتے غزل کہدی بیٹھے بیٹھے قصیدہ کہہ ڈالا بڑے سے بڑے استاد کو مشاعرہ میں ٹوک دیا، آدمی کیا آفت تھا، معلومات کا یہ حال تھا کہ ایک دریا تھا دریا۔ تجلی، متانت، ثقاہت سنجیدگی میں بالکل کیفی کا جواب تھا، کیفی رندانہ مزاج تو یہ صوفی منش مگر تھی دونوں میں بڑی دوستی! مست تو بس مستِ الست ہی تھا کیا کہوں کیسی طبیعت پائی تھی دنیا بھر کی شرارتیں ظالم میں موجود ہر جھگڑے ہر فساد ہر بکھیڑے کا بانی یہی ہوتا تھا چاہے وہ جو کچھ کر گذرے بھلا ہو یا برا یہ سب لوگ اس کا ساتھ دیتے کیفی نے تو خصوصیت سے اس کا ساتھ دیا ہر معاملہ میں سینہ سپر نظر آتا تھا

بھائی دوست ہوں تو ایسے ہوں! داد کا کیا پوچھنا بلا کا پُرگو غضب کا منسوڑیہ دو دو پیسے والی چھوٹی چھوٹی نظموں کے چھپوانے کا طریقہ اسی ظالم نے رائج کیا عجیب آدمی تھا مگر ان سب کے پیرِ مُغاں تھے مگر سب کے ساتھ! زور کی منہ زوری کیا کہوں کس کی مجال تھی کہ مشاعرے میں داد نہ دے! ابھی تاریخ گوئی میں کامل بلکہ اکمل تھا اب ایسا تاریخ گو کوئی نہیں رہا۔ استادِ داغ کا کیا پوچھنا بلبلِ ہندوستان تھا وہ روزمرہ، وہ سلاست، وہ زباں، وہ مضامین واقعہ یہ ہے کہ خدائے سخن تھا، اس پر سخنوری ختم ہوگئی، تیرؔ کی فارسی کا استاد تھا مگر اردو میں بھی کچھ کم نہ تھا کسی کو خاطر میں تھوڑا ہی لاتا تھا کہتا ہے ؎

اچھا ہوا کہ پہلے ہی مجھ سے گذر گئے سعدیؔ و انوریؔ و دقیقیؔ و رودکی
ورنہ دکھا کے رنگِ طرازِ سخن انہیں کچھ ٹوٹی پھوٹی انکی بھی سُن لیتا پارسی

ہر ایک اپنے اپنے وقت کا استاد تھا۔ اللہ اللہ کیسی صحبتیں تھیں، کیا زمانہ تھا یہ لوگ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ شاعر گر بھی تھے انکی صحبت میں ہزار وں شاعر، ادیب عالم فاضل ہوگئے۔

تم صرف محرم کو یاد کرتے ہو آجی عرس میلے جھگڑے، مینا بازار، جاترا، جشن ہر چیز مستقل تھی، مولاؔ کا عرس، باباشرف الدینؒ کا عرس، امام ضامن کا عرس، خواجہ کے چلے کا عرس، تمام درگاہوں کے جھگڑے، الوال، گلشن باغ وغیرہ کی جاترا نواب حفیظ اللہ خاں کے پالکی کا جشن، کیسی دلچسپیاں تھیں جھگڑوں میں کیسی

کیسی صورتیں نظر آتی تھیں، تمہارے والدِ مرحوم نے ایک جھگڑے ہی میں نہیں یہ مطلع سنایا تھا ؎

نظر پڑتی ہے جب میری کسی کی اچھی صورت پر
تو ہوتا ہوں میں صدقے صانعِ قدرت کی صنعت پر

شاید کیفی مرحوم نے بھی۔ ع

توڑے رے توڑے میرے پاؤں کے پائل توڑے

والی غزل جھگڑے ہی میں کہی تھی رسوا[۱] صاحب کی مشہور "چولی کے بند" والی غزل بھی انہیں جھگڑوں کی یادگار ہے

ہولی دیوالی بھی خاص تھی اسوقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر اتفاق تھا دیوالی میں تمام ہندوؤنکی دوکانیں مسلماں دوستوں سے بھری رہتی تھیں ایک دوسرے سے کیسے برادرانہ طریقے سے ملتے۔ درد دکھ رنج وغم کے شریک تھے میاں ابتک بھی کچھ اتفاق حیدرآباد میں باقی ہے یہاں سے باہر جائیے تو معلوم ہوگا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہیں دشمن! خدا حیدرآباد میں اس اتحاد کو قائم رکھے۔

میر صاحب نے تہذیب و تمدن سیاست، مذہب غرض ہر چیز پر اظہار خیال فرمایا انکی تقریر اس قدر دلچسپ اور لچھے دار ہوتی ہے کہ ختم ہونیکا نام ہی

---

[۱] حضرت مولوی میرزا غلام مصطفےٰ رسا

نہیں آتا۔ بہ وقت تمام ہم نے دوسری گفتگو چھیڑی۔ کچھ انکی صحت کے متعلق کچھ گھر کے متعلق کچھ بچوں کی مزاج پرسی مگر اس موضوع پر بھی ایک ایک مستقل لکچر بڑی زور کا سنایا، آخر میں نلوں کے پانی کی وجہ ملیریا اور الکٹرک کی وجہ طاعون کے رہنے کا رونا بھی روتے رہے سلطان شاہی کے مکان کے آرایش بلدہ میں جانیکا ذکر کیا تو دیر تک اس محلہ کی ویرانی کا تذکرہ اور آرائش بلدہ کی صنوت وغیرہ بیان فرمایا، بچوں پر تو بس برس ہی پڑے ۔نا فرمانی ،تعلیم سے عدم دلچسپی بے ادبی، گستاخی پر نہایت ہی فاضلانہ خیالات کا اظہار فرمایا اسی مصروفیت میں تین بجگئے۔ ہماری آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ میر صاحب کے ساتھ کھانا کھائیں مگر پھر اس خوف سے کہ شام تک میر صاحب کی مسلسل تقریر کے مزے لینا پڑے گا ہم نے جمائیاں لینی شروع کیں بارے میر صاحب بھی کچھ سمجھ گئے اجازت چاہی تو بزرگوں کی روایت اور اپنی محبت کا اظہار فرما کر ملتے رہنے کی نصیحت اور گھر پر آنے کی ہدایت فرمائی اور ساڑھے تین بجے تشریف لیگئے۔

مولوی سردار علی صاحب نے مضمون کیلئے فرمایا تھا ہم نے دوسرے دن مضمون دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا میر صاحب سدّ راہ نہ ہوتے ہم کتبخانہ آصفیہ پہنچکر کچھ میٹیریل لا لیتے مگر انہوں نے نہ صرف وقت خراب کیا بلکہ دماغ کو بھی تقریباً ایک ہفتہ کیلئے رخصت اتفاقی دیدی ہمنے کہا کہ دوسرا کوئی

کام تو ہو نہیں سکتا میر صاحب کی ملاقات اور اُونکی گفتگو کا مختصر حال ہی لکھ لیں یہ ہے اس بکواس کی شانِ نزول! یہ صرف بکواس ہی بکواس نہیں ذرا غور کے قابل بھی چیز ہے۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند (اقبال)

اللہ بس

میرزا صاحب

مرزا صاحب خدا رکھے ہیں بڑے خلیق آدمی، بینائی میں فرق آگیا ہے کان بھی جواب دے رہے ہیں۔ قوت بھی گھٹ گئی ہے مگر کیا مجال جو حضرت کے معمول میں فرق آئے وہی صبح دس بجے سے خانہ شماری شروع کی تو بس ایک بجا دیا اور پھر چھ بجے گھر سے نکلے تو واپسی کا نام نہیں، کبھی آٹھ نو بجے گھر لوٹے تو کبھی بارہ بجے اور کبھی رات بھر غائب، تمام شہر کی خاک چھان لینگے ہر ایک دوست سے ملیں گے امکانی ہمدردی کرینگے تب کہیں چین آتا ہے

دُبلے پتلے تیر کی طرح سیدھے آدمی متوسط قد، گُھٹا ہوا سر خشخشی ڈاڑھی جس کے بال آدھے سے زیادہ سفید، بل کھائی ہوئی مونچھیں، سرمہ آلود آنکھیں، سیاہ شملہ، باریک کپڑے کی ہلکی شیروانی، ہرک کا چُست پاجامہ دلّی کا سادہ جوتا۔ ہاتھ میں پتلی سی بنوٹ کی لکڑی شام لگی ہوئی سیدھے ہاتھ کی انگلی میں آخری چہار شنبہ کا چھلّا الٹے ہاتھ میں فیروزہ کی انگوٹھی اور مضراب، کندھے پر

رومال جیب میں پان کا بٹوا ایک تھیلی میں شطرنج کے مہرے اور کاغذ۔ رکابِ سعادت کے منصبدار سوائے دوست احباب کے اور کسی کی فکر نہیں صبح ہوئی اور آپ اٹھ بیٹھے ضروریات سے فارغ ہوئے چائے پی اور دیوان خانہ میں آ بیٹھے کوئی آ گیا تو بساط بچھ گئی ورنہ ستار بجانے لگے ساڑھے نو بجے کھانا کھایا اور بٹوے میں پان بھر کر چلے، حضرت کے ملنے والے بھی خدا کے فضل سے اکثر انہیں کے جیسے بے فکرے، کسی کے پاس تھوڑی دیر ستار بجاتے رہے، کہیں ایک دو بازیاں شطرنج کی ہو گئیں، کسی جگہ گنجفہ اڑا، شطرنج کا شوق نہیں بلکہ جنون ہے اب تو شاید کچھ کمی ہے مگر ایک زمانہ میں سنتے ہیں کہ "جوش" تھا اس "جوشِ جنون" کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت میرزا صاحب کے کوئی عزیز بیمار تھے اور برا حال تھا صبح صبح شیشہ لیکر نکلے حکیم صاحب سے ملاقات کی مریض کا حال کہا دوا لی اور واپس چلے، راستہ میں ایک دوست نے کہا کہ بھئی میرزا آؤ ایک بات ہو جائے، بس میرزا صاحب بیٹھ گئے بارہ بج گئے مگر انہیں خبر نہ ہوئی ادھر قریب المرگ بیمار نے تاب انتظار نہ لا کر داعی اجل کو لبیک بھی کہہ دیا۔ مگر میرزا صاحب کی بازی ختم نہ ہوئی دوا لئے بیٹھے رہے ایک لڑکے نے آ کر موت کی اطلاع دی اور میرزا صاحب پریشان ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے مگر مدِ مقابل کے یہ کہنے پر کہ میرزا مات ہماری تھی تمہارا فرزین تو پھنس گیا، پھر بیٹھ گئے اور لگے کھیلنے ادھر لوگوں نے میت کی تجہیز و تکفین کی اور عصر کی نماز کے وقت جنازہ مسجد کو پہونچا جب ایک شخص نے

سب جھوٹ ہے۔ بے شک گھر میں ہو سکتا ہے
باہر نہیں [illegible]

میرزا صاحب کو اسکی اطلاع دی تو ادھوری بازی چھوڑ کر مجبوراً مسجد جا پہونچے۔

اس قصہ کی واقعیت میں شک نہیں اس لئے کہ جب کبھی ہم نے اس قصہ کے متعلق میرزا صاحب سے کچھ پوچھا تو انہوں نے "بھئی لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں" کہکر خاموشی اختیار کی، اگر اصلیت نہ ہوتی تو وہ ضرور تردید کر دیتے۔

محرم کی دسویں تاریخ اتفاق سے میرزا صاحب مل گئے۔ سیاہ شیروانی گلے کی گھنڈیاں کھلی ہوئیں، شملہ ندارد، کھلے سر، پاجامہ کے پائیچے چڑھے ہوئے برہنہ پا بغل میں سونے کے قبضہ کی عباسی (تلوار) سیدھے ہاتھ میں خاک شفا کی تسبیح، ہونٹ منہ خشک، چہرا اترا ہوا، منہ میں پان نہ آنکھوں میں سُرمہ، پہلے تو ہم میرزا صاحب کو دیکھ کر چکرائے مگر پھر شہادت کے روز کا خیال آگیا تو ہم نے "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کیا ڈرتا تھا کہ کہیں ہم کو ٹوپی اور جوتا پہنے ہوئے دیکھ کر حضرت بگڑ نہ جائیں مگر خیر یہ گذری کہ صرف علیک سلیک پر بلا ٹلی البتہ جاتے جاتے میرزا صاحب نے پرسوں ذرا مل لینا، فرما دیا۔

میرزا صاحب کے بھکڑپن سے ہماری روح ہی فنا ہوتی ہے ہم نے سوچا کہ میرزا صاحب سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائیگی۔ راستہ میں جہاں کہیں ملاقات ہوگی حضرت لتے لے ڈالینگے وہ وہ بے نقط سنائینگے کہ توبہ، سنگ آمد وسخت آمد کھٹکر پہونچ ہی گئے میرزا صاحب دیوانخانے میں بیٹھے ایک صاحب کو منٹ کے کچھ زبانی گر بتا رہے تھے ایک شخص کو موجودہ پاکر مسرت ہوئی کہ چلو اسی غیبت سے

میرزا صاحب کو جھک جھک کرتے دو ہم تھوڑی دیر بیٹھکر چلے آئینگے مگر ہمارا بیٹھنا ہی تھا کہ میرزا صاحب نے اپنا لکچر ختم کر دیا اور متوجہ ہوگئے ہماری طرف، رسمی گفتگو کے بعد ستار ہارمونیم کا موازنہ شروع کیا اور دیر تک اس پر روشنی ڈالتے رہے پھر سُرود فنڈل، سے لیکر مضمار، جلترنگ اور بالسن تک کے بجانے کے طریقے اور اس فن شریف کے اساتذہ کے اسماء گرامی معہ مختصر حاشیہ کے سناتے رہے، وہ غریب جو پہلے سے بیٹھا ہوا میرزا صاحب سے گفتگو کر رہا تھا یہ دیکھکر کہ میرزا صاحب ہم سے نہایت ہی انہماک سے گفتگو کر رہے ہیں چلتا بنا؛ اب صرف ہیں ہم تھے دیر تک یہی گفتگو ہوتی رہی، آخر ہم نے عرض کیا، قبلہ! ہمیں کیوں یاد فرمایا تھا کہنے لگے،

میاں بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ملنے والے سب مر مٹے، دیکھو نا، کیفی نہ رہے، ہست نے دار وٗے اجل پی لی، قطب الدین مدت ہوئی مر گئے، لے دیکے ایک تمہارے والد رہ گئے تھے مگر آخر وقت میں انہوں نے بھی ہم سے کنارہ کر لیا قبل از وقت داغ دیگئے اب ایک ٹھمک کی کنکری نجو میاں رہ گئے ہیں مگر ان کا حال ہم سے بُرا ہے آنکھیں ہم سے زیادہ خراب ہوگئیں قوت تو بالکل نہ رہی گھٹنوں کے درد نے بیچاروں کو معذور کر دیا ہم کو جب کبھی کسی معاملہ میں صلاح مشورہ کرنے کی ضرورت ہوتی تو انہیں لوگوں سے رائے لیتے بھئی یہ لوگ تھے بھی بڑے قابل بڑی دور اندیشی سے ہر ایک بات پر غور کر کے رائے دیتے ان لوگوں کا ہمنشیں کوئی نہ رہا پرسوں تم نظر آئے تو ہم نے کہا چلو تمہیں سے کچھ مشورہ کریں بات

دراصل یہ ہے کہ خدا سلامت رکھے حضور کو ہماری آسایش کا ہر طرح سے انتظام فرما رہے ہیں دیکھو نا یہ آئے دن کے "طاعون" اور انفلوئنزا" (انفلوئنزا) میعادی بخار وغیرہ میں ہم لوگوں کو مبتلا دیکھ کر حضور نے پختہ موریاں بنوانے کا حکم صادر فرما دیا محلے وسیع ہو رہے ہیں جگہ جگہ چمن بندی ہو رہی ہے سرکاری مکانات بن رہے ہیں دوکانوں کیلئے سائبان تیار ہو رہے ہیں۔ دیکھو کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے یہی حیدرآباد جو آج کل دلہن کی طرح سجا سجایا نظر آرہا ہے آج سے بیس اکیس سال پہلے بالکل برباد ہو چکا تھا ویران تھا جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر خاک کے تودے بڑے بڑے غار نظر آتے تھے یہ کاہے کے تھے معلوم ہے؟ اجی اس منحوس ندی کی طغیانی نے بغضب خدا کا آدھا شہر اجڑ گیا تھا۔ میاں تم چھوٹے تھے پانچ سات برس کی عمر ہوگی تمہیں تفصیل کیا معلوم ہم نے آنکھوں سے دیکھا ہے آ، یوں تو شہر میں کئی وقت طغیانیاں آئیں مرزا صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ۱۶۳۱ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں سب سے پہلی طغیانی آئی تھی بیچ شہر تک پانی آگیا تھا اس کے بعد ۱۷۶۸ء میں نواب میر نظام علیخاں کے زمانے میں بھی طغیانی ہوئی مگر ایسا زیادہ نقصان نہیں ہوا نواب ناصرالدولہ کے زمانہ میں ۱۸۳۱ء کا سیلاب خود بڑے میرزا صاحب نے دیکھا تھا وہ فرماتے تھے کہ وہ بھی عظیم الشان طغیانی تھی۔ گھانسی میاں کا بازار۔ سدی عنبر کا بازار بہہ گیا تھا ۱۹۰۳ء کی طغیانی ہم نے بھی دیکھی ہے اسوقت ہم جوان تھے مگر یہ کوئی بڑی طغیانی نہ تھی معمولی تھی قیامت تو بس

۱۹۰۸ء میں آدھی وسط رمضان شریف تک حیدرآباد میں بارش نہ ہوئی تھی، لوگ چاہتے تھے کہ پانی برسے ۲۲، ۲۳ شعبان سے یکایک پانی برسنے لگا چند دنوں تک تو یونہی معمولی بارش ہوتی رہی مگر بعد میں زور بڑھ گیا غضب خدا کا ۲۶ گھنٹوں میں ۱۶ انچ بارش ہوگئی اس کثرت سے پانی پڑا کہ جل تھل ہوگیا ندی تالاب ایک ہوگئے ۲۸ شعبان کی رات کو یکایک پانی بڑھ گیا اور آبادی میں گھسنے لگا صبح تک مستعد پورہ۔ بیگم بازار۔ گھانسی میاں کا بازار امین باغ تمام پانی میں چھپ گئے تھے دوپہر تک کاروان، ڈھول پیٹہ، افضل گنج، بازار سدی عنبر، فیل خانہ، توپ خانہ، گوشہ محل، گول بنگلہ، گولی گوڑہ، ہتیلیوں کی باؤلی، رسیدنسی، محی الدین پاشا کا باغ، جام باغ، کاچی گوڑہ بھی تہ آب تھا اور زور بڑھتا جارہا تھا تھوڑی دیر کے بعد کشن باغ، بہادر پورہ، چیکنی پورہ، کبوتر خانہ، محبوب پورہ مہندی، اردو، چار محل، دارالشفا، عثمان پورہ بھی پانی میں تیرتا نظر آرہا تھا، وہ عمارتیں جو تا قیامت پائدار سمجھی جارہی تھیں حباب کی طرح بہ گئیں۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ گئے، غضب خدا کا تھا وہ جیسا عظیم الشان ہاتھی اجی ہاتھی کیا۔ پہاڑ سمجھو تنکے کی طرح بہ گیا، پرانا پل، مسلم پل، افضل گنج کا پل، چادر گھاٹ کا پل سبھی کاڑیوں کی ڈبیوں کی طرح بہ گئے افضل گنج کا دوا خانہ بیماروں سمیت بہ گیا، عدالت العالیہ کی بنیاد ہل گئی۔ ٹھگی جیل کی اینٹ سے اینٹ بجگئی۔ زچگی خانہ وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل معہ زچاؤں اور بچوں کے نہ جانے کس طرف بہ گیا فیاض علیخاں

کی کوٹھی کا پتہ بھی نہ رہا۔ وہ رسی ڈونگی کے اول مددگار کا بنگلہ ایسے معنوں میں آیا کہ پتہ نہ لگا۔ افضل گنج کا انگریزی ٹپہ خانہ رسی ڈونگی کا تار گھر بھی بہہ گیا، اجی ایک دو ہو تو کہتے جائیں ندی کے دو طرفہ فقط خاک کا ڈھیر تھا یا بڑے بڑے غار اور کچھ نہیں سارا کاروان موسی ندی کے قافلہ کے ساتھ جا چکا تھا محلہ کا پتہ نہ تھا، کوکہ کی ٹٹی معلوم نہیں کہ ہوا سے اڑی یا پانی سے بہی مگر نام و نشان تک باقی نہ تھا دھول پیٹھ میں واقعی دھول اڑ رہی تھی، پٹیلہ برج ساقط ہو چکا تھا کولسہ واڑی کی آگ ہمیشہ کیلئے بجھ چکی تھی، چنبیا دروازہ پانی کے ڈنڈے سے گلّی کی طرح اڑ چکا تھا گلّی گوڑے کے باشندے بوکھلائے ہوئے اپنا گھر ڈھونڈھتے پھر رہے تھے مگر کوئی نشان باقی نہ تھا۔ چادر گھاٹ بھی نیست و نابود ہو چکا تھا، طغیانی کیا تھی خدا کا غضب تھا غضب قیامت تھی اُف سزائے اعمال کہو اور کیا تھا ہائے کیسے کیسے گھر تباہ ہو گئے وہ امیر جو کبھی اور میانہ کے بغیر ڈیوڑھی سے نہ نکلے تھے تنہا بہ تقدیر سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا بھاگا بھاگ اپنی جان بچا رہے تھے وہ خواتین جن کو کسی غیر محرم نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا جو کبھی چوکھٹ سے باہر نہ ہوئی تھیں بغیر چادر کے چلی جا رہی تھیں آہ ماں بچے کو چھوڑ شوہر بیوی کو چھوڑ بیٹا ماں سے بچھڑ کر بیوی شوہر سے جدا ہو کر اپنی اپنی جان بچا رہے تھے ہائے کیا قیامت تھی بدنصیبوں نے اس پر آشوب وقت میں بھی اپنی عادت نہیں چھوڑی چوریاں کیں، بدفعلیاں کیں بدمعاشیاں کیں۔ خدا سمجھے جو نہ کرنا کیا سا آہ! کیا وقت تھا

مرحوم سرکار کو خداوند عالم کروٹ کروٹ جنت دے وہ انتظام کیا کہ واہ
طغیانی کے روز سرکار پرانی حویلی میں رونق افروز تھے پانی جب بڑھنے لگا تو خانہ
زادوں نے فلک نما پر تشریف لے چلنے کیلئے عرض کیا مگر سرکار کو اپنی عزیز رعایا
کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فرطِ رقت سے چشم پُر آب ہو کر انکار فرما دیتے
تھے منٹ منٹ کی کیفیت سماعت فرماتے رہے طوفان فرو کرنیکی امکانی
تدابیر اختیار فرمائیں مگر وہ کوئی حادثہ ہوتا تو رُکتا وہ تو ہم لوگوں کے اعمال
کی سزا تھی۔ مگر حضور بے انتہا بے چین تھے صبح کو نواب افسر الملک کو طلب فرمایا وہ
اپنی راحت منزل میں تھے مگر میاں سپاہی ہو تو ایسا ہو مالک کا حکم ملتے ہی
گھوڑے پر چڑھ کر چلے تینوں پل ٹوٹ چکے تھے چادر گھاٹ کا پُل لرز رہا تھا
گھٹنوں برابر پانی اُوپر بہہ رہا تھا مگر افسر الملک بہادر نے گھوڑا ڈال ہی تو دیا
آہ وہ پانی کیا تھا بلا تھی ہائے گہرے سُرخ رنگ کا سیاہی مائل پانی اسمیں
بُو اس غضب کی تھی کہ ناک نہ دی جاتی تھی اس پانی میں گھوڑا بھی قدم دھرنے
کا روادار نہ تھا مگر مالک کے حکم سے وہ بھی مجبور ہو گیا نواب صاحب نے
گھوڑے کو رانوں میں مسل کر کوڑا کیا تو غریب تلملا کر چل پڑا جب بیچ پل پر پہنچا
تو تنگ تک بھیگ رہا تھا آخر وقت میں غریب نے تیر کر راستہ طے کیا اور
ادھر نواب صاحب پل سے اُترے اور ادھر ایک دھماکا ہوا اور دھڑام سے
پل گر ا میاں سپاہی ایسے ہوتے ہیں اور مالک کے حکم پر اسطرح جان لڑاتے

تیار ہو جاتے ہیں۔

جب خداؔ ان سرکار نے مجبور کیا تو سرکار موٹر میں سوار ہو کر با دیدۂ پُر آب قصر فلک نما رونق افروز ہوئے مگر اسقدر متاثر تھے کہ دو روز تک خاصہ تناول نہ فرمایا گھڑی گھڑی پل پل کی کیفیت دریافت فرماتے رہے افسر الملک بہادر کو مصیبت زدوں کی امداد کیلئے روانہ فرمایا، دوسری رمضان کو مہاراجہ بہادر کے نام حکم صادر فرمایا کہ پلونکی فوری تعمیر کیجائے اور رعایا کی دلدہی کیجائے، حویلی قدیم اور پنج محلہ کو کھولنے کا حکم صادر فرمایا اور مصیبت زدوں کو ٹھیرا کر انکی خورونوش اور آسایش کا انتظام کرنے کا حکم مرحمت فرمایا شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ سرکاری طور پر مصیبت زدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانا ملنے لگا مہاراجہ بہادر نے بھی بے انتہا مستعدی اور ہمدردی سے خلق اللہ کی مدد کی ہر طرح آسایش بہم پہنچائی ۵ رمضان کو حضور بندگانعالی نے ایک فرمان کے ذریعہ ان خدمات پر اظہار خوشنودی فرمایا سنٹرل ریلیف کمیٹی اور والنٹیروں نے جو کام کیا اس پر ۲۷ شوال کے فرمان مبارک میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا مکانات اور گلی کوچوں میں دبی ہوئی لاشوں کو نکلوا کر دفنانے میں ریلیف کمیٹی، فوج باقاعدہ، صفائی بلدہ اور کوتوالی نے بڑی محنت کی۔ نعشوں میں اس قدر عفونت پیدا ہو گئی تھی کہ سامنے جایا نہیں جاتا تھا اور پھر نہ جانے پانی میں کونسا تیزاب تھا کہ تمام نعشیں گل گئی تھیں۔

دس لنگر خانے سرکار نے قائم فرمائے تھے پانچ ہندوؤں اور پانچ مسلمانوں کیلئے مولوی ظفر علیخاں[1] نے افضل گنج کے لنگر خانے کا نہایت عمدہ انتظام کیا، روزانہ پچاس ہزار آدمی ان لنگر خانوں سے کھانا کھاتے تھے چودہ پندرہ دن تک یہ لنگر خانے قائم رہے کل چھ لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا سینتیس ہزار آٹھ سو نوے روپیے صرف ہوئے ان کے علاوہ چار لنگر خانے سرکار نے جیب خاص سے مقرر فرمائے تھے جو بہت دنوں تک قائم رہے مہاراجہ بہادر نے مصیبت زدوں کیلئے چندو لعل کی بارہ دری کھلوادی تھی سرکار نے اسد باغ کی اجازت مرحمت فرمادی تھی، فتح میدان لال ٹیکری خیریت آباد میں ڈیرے اور جھونپڑیاں بھی ڈلوادی گئی تھیں!

مہاراجہ بہادر نے جریدۂ غیر معمولی کے ذریعہ ۲۳ آبان سے ۲ آذر ۱۳۱۸ف تک دفاتر بلدہ کو عام تعطیل اور تمام ملازمین کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینے کا حکم صادر فرمادیا۔ اور بعد میں اُن ملازمین کی پیشگی ایصال شدہ تنخواہ معاف کردی گئی جو (۵۰ عہ) سے کم پاتے تھے۔

انجمن خواتین نے بھی مصیبت زدوں کی بہت امداد کی سرکار سے تیس ہزار روپیے امداد کیلئے مرحمت ہوئے تھے جنکی ساڑیاں، شطرنجیاں رضائیاں کمبلیں وغیرہ تقسیم کی گئیں!

طغیانی کیا تھی؟ آہ تقریباً ۲۵ محلے بالکل ویران ہوگئے۔ انتیس ہزار مکانات تباہ ہوئے ایک لاکھ آدمی بے خانماں ہوئے اور ان میں سے آدھے سے زیادہ نذر اجل

---

[1] آقا ظفر علیخاں آف زمیندار

ہوئے اس مصیبت پر ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے سے آنسوؤں کے تار بندھ گئے ملک معظم نے وائسرائے نے شہزادہ ویلز نے، گورنر بمبئی نے، مدرسۃ العلوم علیگڈھ نے ندوۃ العلما لکھنو نے ہمدردی کے تار دیئے لندن میں کپتان صاحب سید امیر علی صاحب کو کھلے، علی اکبر لطیفی صاحب وغیرہ نے مل کر شریف لندن (لارڈ میئر) کے زیر صدارت ایک جلسہ کیا اور دس ہزار روپیہ چندہ جمع کیا، شہزادہ ویلز نے بھی دو ہزار روپیہ مرحمت فرمایا، حیدرآباد و سکندرآباد میں بھی بڑے بڑے جلسے ہوئے اور چندہ جمع کرکے مصیبت زدوں کی مدد کی گئی اب کس کو پوری تفصیل یاد ہے تفصیل دیکھنے کا شوق ہے تو رسالہ ادیب حیدرآباد کا طوفان نمبر دیکھو جسے مولوی سید خورشید علی[له] صاحب نے مرتب کیا ہے۔

آہ ایسی ویرانی تھی کہ وہ میاں غالب نے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا" کہا ہے اگر وہ منظر دیکھتے تو گھر کا تصور بھی نہ کرتے واللہ ایک ویرانی تھی جسکو حقیقی معنوں میں ویرانی کہہ سکتے ہیں ایسے تباہ شدہ شہر کو پھر دلہن کی طرح آراستہ کرنا ہمارے مالک حضور پرنور ہی کا کام تھا بھلا اب کوئی کہہ بھی سکتا ہے کہ کبھی یہاں ندی بھی آئی تھی طغیانی بھی ہوئی تھی طوفان بھی اٹھا تھا تالاب بنا کر ندی کا زور ہمیشہ کیلئے توڑ دیا۔ رہی بانس نہ بجی بانسری چلو اب ندی ہی نہ رہی تو طغیانی کہاں سے آئیگی اسطرح ندی کی فکر سے تو نجات ملی اب یہ محلے کھلے اور ہموار ہو جائینگے اور پختہ موریاں بن جائینگی تو ملیریا طاعون بھی دفع ہو جائینگے خداوند عالم حضور کو سلامت رکھے ہماری آسایش کیلئے کس قدر انتظام فرمایا ہے"۔

"لے لاحول ولا میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہاں ہٹی بات یہ ہے کہ آرائش بلدہ

[له] مولنا سید خورشید علی صاحب ظلہ ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی و مناصب و خطابات و سوا ہیر و استیفاء وغیرہ آنریری سکریٹری حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس و بیت المعذورین وغیرہ۔

نے میرے گھر کا ایک کونا مٹرک کی تعمیر کیلئے لینے کا ارادہ کیا ہے پرسوں ہی پیمائش ہوئی ہے اور مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ میں صرف اتنا کونا دینے تیار ہوں یا پورا مکان دینا چاہتا ہوں کہو کیا کروں اسی معاملہ میں تم سے رائے لینی تھی اور اسی لئے میں نے تمہیں ملنے کیلئے کہا تھا میاں اب ہمارے ملنے والے ہیں کون جن سے کچھ پوچھیں سب مرکھپ گئے جو لوگ ہیں وہ ایسے معاملوں سے بے خبر ستار طبلہ سارنگی، نبوٹ کشتی پیراکی مرغ بازی شطرنج سگار کی باتیں پوچھو تو کہیں گے مگر یہ نفع ونقصان کی چیزیں انکی سمجھ میں نہیں آتیں تم لوگ البتہ خوب سمجھتے ہو آخر مدرسہ میں تمہیں سب کچھ سکھلایا گیا ہے تم نے سود در سود کا حساب تو کیا ہو گا نا؟ کٹ متی ملیٹ سو بھی سیکھے ہونگے وہ لوگ یہ چیزیں کیا جانیں ؟

ہم نے اپنا ناقص خیال ظاہر کیا دیر تک رد وقدح ہوتی رہی آخر کسی قدر ترمیم کے ساتھ ہمارا مشورہ خلعت قبول سے سرفراز ہوا ہم نے کہا کہ چلو بھر پایا مگر وہ جانے بھی تو دیں! ماما کو آواز دیکر روٹ اور چونگے منگوا لئے اور ہمیں زبردستی کھلایا دم کے روٹ تھے بڑے لذیز۔ روٹ کھا کر ہمنے اجازت چاہی تو روک کر بساط بچھا دی کہنے لگے آؤ ایک بازی کھیل لیں ہم مار کٹائی کے عادی چند مہریں کھپا کر فرزین مار لیا اور پھر قلعہ توڑ کر مات دیدی مگر میرزا صاحب کھیل کے رسیا اب کہئے میل ملے تو کیسے ایک بازی یوں ہی کھیلی اور مات لیکر اٹھنا چاہا مگر واپسی اتنی آسان نہ تھی جتنی کہ ہم سمجھے ہوئے تھے میرزا صاحب نے طاعون اور ملیریا کے متعلق اپنے معلومات کا اظہار فرمانا شروع کیا

چوہوں کی پیدائش۔ جراثیم کی آمد۔ گلٹی اور اسکی حقیقت۔ آسان ترین علاج پہلے
پلیگ کا مختصر حال اور شہر والوں کی بدحواسی انفلوئنزا اور ملیریا کا فرق دونوں کے وجوہات
طریق علاج پر ایسا ڈاکٹرانہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے انکی طبابت کا بھی لوہا مان لیا۔
پلیگ کی گلٹی پر بھلاواں کوٹ کر لگانا اور مریض کو مٹی کا تیل پلانا، دیکھئے کس قدر
آسان نسخہ ہے اسی طرح انفلوئنزا کیلئے "ست گل بیل" کی چھ آنے والی شیشی کا
ایک ہفتہ استعمال اور ملیریا کیلئے تکہ مسجد کے سامنے کے تنبولی کے پاس کا پان کا
بیڑا (جس کے متعلق مشہور ہے کہ مکھی مار کر پان میں ڈالکر بیڑا بنا دیا جاتا ہے) کسقدر
آسان اور عمدہ نسخے ہیں کاش یہ چیزیں میرزا صاحب کسی ڈاکٹر سے فرماتے ہا ئے
ہوئے ڈاکٹر لاری ورنہ لوٹ ہی تو جاتے!

اس قدر معلومات سے بہرہ اندوز ہونیکے بعد ہمارے دماغ کو بدہضمی ہونے لگی
جماہیوں پر جماہیاں آنے لگیں۔ آنکھیں الگ بند ہو رہی تھیں، سگریٹ کئی گھنٹوں
سے نہ پینے کی وجہ پیٹ میں بھی درد ہونے لگا ہم نے بکمال لجاجت واپسی کی
اجازت چاہی اور میرزا صاحب نے بکمال سرفرازی اجازت دیدی۔ جی تو چاہتا
ہے کہ حضرت کی شان میں کم از کم ایک قصیدہ لکھا جائے اور پھر اس خیال سے
کہ پرانی وضع کے ہیں لوگ ان کو کچھ نہ کہو خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

مولوی جی

ہمارے مولوی جی مدرسے کے معلّم یا مسجد کے پیش امام نہیں۔ اور نہ مولوی اصغر کے خاندان کے رکن ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود مولوی اور صرف مولوی ہیں۔

والد بزرگوار مولوی جی کے متعلق فرماتے تھے۔ کہ مولوی جی کے والد گڑاکو کی دوکان کرتے تھے۔ انکی دوکان کا خمیرہ سارے شہر میں مشہور تھا۔ مولوی جی کی ابتدائی تعلیم محلہ کی مسجد میں ہوئی۔ بغدادی قاعدہ ختم کر کے کلام اللہ کی تعلیم پائی۔ اور پھر آمدنامہ۔ کریما۔ مامقیماں۔ رقعات عنایت علی وغیرہ وغیرہ۔ اسی مسجد کے ملّاں جی یا میاں جی سے ختم کیں۔ اور پنچ گوڑہ کے مشہور عامل حضرت ہدایت علی صاحب مرحوم سے۔ نجوم۔ جفر۔ رمل۔ تعویذ فلیتہ۔ گنڈا۔ چھو منتر وغیرہ کی سند لی۔ سنا ہے کہ مشہور پٹوٹ باز استاد ننگش سے چند روز لکڑی بھی سیکھی۔ مگر پیترے برابر نہ پڑتے تھے۔ مجبوراً ترک کر دیا۔ مگر

اپنے تئیں ہمیشہ بڑے تلوار یئے پھکیت، بنوٹیے سمجھا کئے۔ مولوی نادر الزماں مرحوم کے حلقۂ درس میں مدتوں شرکت کی۔ پڑھا تو کچھ بھی نہیں۔ صرف سنا کرتے تھے حضرت فیض اور حضرت مسکین کے مشاعرے میں سب سے پہلے موجود رہتے تھے محرم کے زمانہ میں نتھو بیگ اور نصر اللہ کے رنگ کی سیر بھی کر لیتے۔ باپ کے مرنے پر دوکان سنبھالی مگر قدرت نے انہیں مولویانہ دماغ دیا تھا۔ بیوپار کیلئے کسی طرح موزوں ثابت نہ ہوئے۔ دوسرے ہی سال دیوالہ پٹ گیا۔ اور مولوی جی بیک بینی و دوگوش دوکان سے نکلے۔ یہ مختصر سوانح تھی جو والد مغفور نے ایک دفعہ ہم سے بیان فرمایا تھا!

ہم اپنے بچپن سے مولوی جی کو ایک حالت پر دیکھ رہے ہیں والد مغفور کے پاس ہمیشہ تشریف لاتے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجامہ (اندر کھدر کا چھا تیا) پاؤں میں مارکٹ کا کھیتلا جوتا۔ گھٹنوں سے نیچا لانبا کرتا۔ اندر کھدر کی موٹی نیم آستین ڈھیلا ڈھالا ململ کا شاہا سر پہ سفید بہ مقدار علم شملہ، کندھے پر چرپالی صوفیانہ رومال آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ۔ ڈاڑھی چنبیلی کے تیل سے چپی ہوئی دانت کثرت پان خوری سے لال مگر ہونٹ بالکل سفید۔

منشی قمر الدین صاحب اور نتھو چچا مولوی جی کو بے طرح ستاتے مگر وہ بگڑتے بہت کم تھے۔ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے۔ ایک دفعہ ان حضرات نے پانمیں مسی ڈال کر دیدیا مولوی گلوری چبا گئے۔ مگر انہیں گھر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ

ہونٹوں پر دُہری جمگھی ہی۔ بہت بگڑے کئی دن تک اُن لوگوں سے گفتگو نہ کی مگر یہ حضرات چوکنے والے تھوڑے ہی تھے۔ خوشامد کر کے منا ہی لیا۔

آخری چہار شنبہ اس زمانہ میں خاص اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ یارانِ بے تکلف میر عالم کے تالاب پر پہنچ گئے۔ اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر مولوی جی کو بھی ساتھ لے لیا۔ بارہ بجے کھانا کھا کر لوگوں کو تیراکی سُوجھی سبھوں نے شریفانہ لباس اتار کر لنگوٹ۔ جانگیا۔ رومال باندھ لیا اور لگے تیرنے مولوی جی تیرنا جانتے نہ تھے۔ سنجوؔ چچا نے پانچ منٹ میں تیرنا سکھانے کا وعدہ کر کے مولوی جی کے کپڑے اتروا دیئے اور رومال بندھوا کر تالاب میں ڈھکیل ہی تو دیا۔ بیچارے غوطے کھاتے رہے بڑی دیر کے بعد اُنہیں سنبھالا۔ اور کنارے چھوڑ گئے۔ مولوی جی چونکہ تھک گئے تھے۔ اس لئے دیر تک تالاب کے کنارے لیٹے رہے۔ سبھوں نے تیرنا ختم کیا اور کپڑے پہن کر مختلف کھیلوں میں مصروف ہو گئے۔ کسی طرف شطرنج ہونے لگی کوئی پچیسی لے بیٹھا۔ کہیں پر تاش اڑنے لگا۔ کسی نے ڈومنا (ترکی گنجفہ) شروع کیا۔ بھلا اب مولوی جی سے نچلا بیٹھا جاتا تھا۔ لیٹے لیٹے اُٹھ کھڑے ہوئے کونا کونا دیکھ ڈالا۔ ہر جگہ ڈھونڈا مگر کپڑے ندارد۔ بھیگا رومال باندھے ہوئے سب لوگوں کے بیچ میں آ گئے اور لگے عربی آمیز اردو میں رجز خوانی کرنے کبھی انکی تان منشی قمر الدین صاحب پر ٹوٹتی اور کبھی سنجوؔ چچا پر۔ بہر حال ایک گھنٹہ تک مولوی جی نے سلسل فصاحت و بلاغت کے دریا "لب تالاب کے کنارے"

بہائے۔ تب کہیں محبوب بیگ صاحب نے انہیں پتہ دیا کہ کپڑے گٹھڑی کی شکل میں برگد کے درخت پر لگے ہوئے ہیں۔ مشکل یہ تھی کہ مولوی جی درخت پر بھی نہیں چڑھ سکتے تھے۔ بیچارے سیّد نے ان کو کپڑے نکال دیئے۔ مولوی جی نے سیّد کو دعا اور سبھوں کو گالیاں دیتے ہوئے نیم آستین۔ کرتا شاہ پہن لیا۔ اب جو پیجامہ پہنتے ہیں تو کلیاں ہیں نہ رومالی۔ صرف پائینچے اور نیفہ بس آگ ہی تو ہو گئے۔ وہ وہ محاورے سنانے لگے کہ شاید ہی کسی نے ایسی تقریر کبھی سنی ہوگی۔ دیر تک خطبہ دیتے رہے۔ مگر جب سیّد نے نجّو چچا کے آگے مٹھائی کی کشتی اور چائے کا سٹ لگا دیا تو آپ بھی عمامہ باندھتے ہوئے پہنچ گئے۔ ایک بالائی کی پوری۔ دو تین گلاب جامن اور تقریباً پاؤ بھر برفی کھا کر ایک لب بند۔ لب سوز۔ لب ریز پیالی خالی کر دی۔ تب کہیں چین آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی جی خوش تھے۔ نہ تو ڈوبنے کا ملال تھا نہ پاجامے کا رنج۔ مجسم زندہ دلی تھے۔

والد مرحوم جب تک شہر میں تھے مولوی جی برابر آتے رہے جب وہ باہر گئے تو مولوی جی نے آنا جانا ترک کر دیا۔ کبھی کبھار راستہ میں مل جاتے تو پُرخلوص علیک سلیک ضرور ہو جاتی تھی۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد ایک دفعہ غریب خانہ پر تشریف لائے نہایت خلوص سے پُرسا دیا خود بھی روئے ہمیں بھی رُلایا اور چلتے بنے۔

رمضان کی عید کے دوسرے روز ٹھیک ڈیڑھ بجے چلچلاتی دھوپ میں ہم جا رہے تھے لطیف الدین صاحب کے پاس اتفاقاً دبیے ہوئے ہیں حضرت نے دیکھ لیا۔ اور لگے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے اجی میاں، اُو عابد میاں بھئی تمکین، اجی کاظمی صاحب، اُو حضرت، بھلا ہماری کیا مجال تھی جو آگے بڑھتے۔ سائیکل روک لیا۔ اور حضرت سے مخاطب ہو گئے۔ عید کی مبارکباد نمازِ عید کا تذکرہ۔ روزوں کے متعلق استفسار اور گرمی کا دکھڑا ایک ہی سانس میں سب کچھ سنا دیا۔ ہم تو پسینے میں نہا گئے۔ نئی شیروانی بھیگ گئی۔ ہم نے کہا تقصیر معاف ہمیں بخارِ کہنہ ہے دھوپ میں تکلیف ہوتی ہے۔ بس ہمارا ہاتھ تھام کر گلی کا رُخ کیا۔ ایک پست سفال پوش مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی اور کواڑ کھلتے پر خود اندر تشریف لے گئے۔ چار منٹ کے بعد نہایت ہی قرأت کے ساتھ اندر تشریف لانے کی تلاوت فرمانے لگے۔ ہم نے بصد مشکل دو تین بار پھٹے ہوئے ٹاٹ کے پردے میں الجھ کر اپنے آپ کو معہ سائیکل دروازے کے اندر پہنچا دیا۔ ایک مختصر حجرے میں جس میں ایک پھٹا ہوا بوریا اور اسکے اوپر پرانی شطرنجی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک سوزنی یا چاندنی ایسی بچھی ہوئی تھی جس کا کوئی مستقل رنگ شاید ہی کبھی ہو۔ حجرہ بلا مبالغہ چھ فٹ مربع اور اسی قدر اونچا ہو گا۔ ہم نے ایک کونے میں ڈیرہ ڈال دیا۔ مولوی جی صدر میں متمکن ہو گئے اور لگے زمزمہ سرائی کرنے خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی کی لڑائی۔ ابن سعود کے

اعتقادات، حکیم اجمل خاں مرحوم کی خدمات، مولوی شبیر احمد کے وعظ، ترکوں کی معاشرت، امیر کابل کی سیاحت۔ ملکۂ کابل کی بے پردگی۔ غرض دنیا کی کوئی چیز ایسی نہ بچی جس کا تذکرہ مولوی جی نے نہ فرمایا ہو۔ اور پھر اس پر اپنے خیال کا اظہار نہ کیا ہو۔ اخیر میں اگلی صحبتیں یاد آگئیں۔ کہنے لگے میاں وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ خدا غریق رحمت کرے تمہارے والد بخّو میاں منشی قمر الدین ستّار خاں، عبداللہ خاں، مولوی اسمٰعیل غوثو میاں کیسے کیسے لوگ تھے کچھ تو مر گئے اور جو باقی ہیں وہ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں، نہ فراغت ہے نہ اطمینان۔ نہ زندہ دلی ہے نہ چہل۔ دل ہی تو بجھ گئے۔ وہ آخری چہار شنبہ کے جلسے۔ وہ مولا کا عرس۔ وہ لنگم پلی کا میلا۔ وہ عرسوں کے جھگڑے وہ محرم کے رنگ۔ وہ نویں کی رات کوالاؤں کی زیارت وہ سرکاری لنگر ہائے۔ اللہ کیا زمانہ تھا۔ اجی ہم کس عرس میں نہ جاتے تھے۔ کون سے میلے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ کونسی محفل چھوٹتی تھی۔ ہائے ہائے کیا پاکیزہ صحبت تھی۔ رند نیے تو پکے رند۔ کوئی عرس۔ کوئی میلا۔ کوئی جھگڑا نہ چھوٹا۔ سبھی عالم فاضل تھے۔ کیسے کیسے مباحثے ہوتے۔ جاالعالم سے بحثیں ہوتیں۔ عبدالحی وحابی سے مناظرہ ہوتا۔ ترکی سے فارسی میں جھڑپ ہوتی تو مائل سے اردو میں۔ خدا مغفرت کرے قطب میاں اجی وہی کیفی تو غضب تھا غضب کسی کو بڑھنے نہ دیتا۔ غلام حسین واد عبدالحی باترغ۔ سورج بہان بیکش۔ ثاقب۔ کیفی۔ ناظم۔ تجلّی۔ تشنہ۔ تسلی

شوق کیسے کیسے شاعر تھے۔ مشاعرہ انہیں کی وجہ سے ہوتا تھا۔ ہائے سب کے سب مر گئے۔ معلوم نہیں مولوی جی یاران رفتہ پر کب تک ماتم کرتے خیر یہ گذری کہ ہمیں مارے گرمی کے شدید درد سر ہونے لگا اور ہم معافی مانگ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کے گھر سے نکل کر سیدھے حسین ساگر کے کٹے پر جا کر دم لیا۔

منشی جی

منشی جی کی ہستی علمی دنیا کیلئے بہت مفید اور کاروباری دنیا کیلئے بے انتہا ضروری ہے۔ یہ منشی جی کسی گورے کو نہیں پڑھاتے۔ کسی دفتر میں کام نہیں کرتے۔ کسی دوکان سے تعلق نہیں رکھتے۔ کسی شخصیت کے محتاج نہیں۔ اپنے قلم سے آپ روزی کماتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں۔ اوروں کو کھلاتے ہیں۔ غالب نے انہیں کیلئے کہا تھا ؎

کوئی لکھوائے انکو خط تو آکر ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور رکھ کر کان کے اوپر قلم نکلے

منشی جی خدا کے فضل سے وقت کے بہت پابند ہیں۔ صبح ½ ۵ بجے خواب راحت سے بیدار ہوتے ہیں۔ اگر جیب میں زیادہ "زیرگاری" ہو (جسکو منشی جی اپنی اصطلاح میں "خردہ" کہتے ہیں) تو گھر سے سیدھے "مغل ہوٹل" کو چلے اور "نہاری کلچوں" کا ناشتہ اڑایا۔ ایک لب بند نسب زیر۔ بالائی آمیز

مگر لب سوز نہیں برف انگیز چائے کی پیالی پی لی۔ اور آٹھ پیسے کی "افیون" گھلا گھلا کر کھائی۔ اور پھر چلے۔ اس وقت منشی جی نظام الملک طوسی یا ابوالفضل فیضی سے کم نظر نہیں آتے۔ ہزاروں شعر نوکِ زبان گلستاں بوستاں۔ کریما۔ مقیماں کے شعر۔ آمدن نامہ کی گردانیں منہ ہی منہ میں دہراتے ہوئے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب "عاشور خانہ" تک وہاں پہنچتے ہی سب رفو چکر۔ صرف ایک شعر بلکہ بعض وقت ایک ہی مصرع

بہ تمنائے گوشت مردن بہ

حافظہ میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ نکڑ ہی سے قصائی کو گھورتے ہوئے دکاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ آیندہ کا وعدہ۔ منحوس طاعون کا تذکرہ۔ اپنے محلہ کی حالت نہاری کی بدمزگی۔ کلیجوں میں گھی کی کمی۔ چارہ کی خرابی۔ دودھ اور شکر کی کمی بارش کی قلت۔ چارہ کا عنقا ہونا۔ بکروں کی گرانی۔ مگر باوجود اسکے مخاطب کا عمدہ بکرے لانا اور ارزاں گوشت فروخت کرنا۔ یہ تمام باتیں وقتِ واحد میں نہایت ہی چرب زبانی بلکہ شیوہ بیانی کے ساتھ کیجاتی ہیں۔ "بڑے صاحب" اپنے مال کی تعریف اور پھر گرانی کے باوجود ارزاں فروخت کرنے کا حال سنکر پھول ہی تو جاتے ہیں۔ اِدھر اُدھر گھور کر دیکھا۔ ذرا مونچھوں کو کھڑا کیا اور پھر پوچھا "منشی صاحب پسندے دوں یا قیمہ" منشی جی نے وقار آمیز متانت کے ساتھ قیمہ مانگا۔ اور ایک پتے میں پاؤ بھر قیمہ۔ بلّی کیلئے چند

ہڈیاں۔ کچھ چھچھڑے لیکر چلے۔ "کمیلے کی مسجد" کے ہاں سے ادرک لہسن گرم مصالحہ دال۔ نمک۔ پودینہ۔ کوتمر۔ زیرہ۔ لوبچار۔ امچور۔ اور چھوٹے چھوٹے بینگن لیکر ٹھیک سات بجے گھر پر موجود۔

اور پھر دس منٹ کے بعد منشی جی ایک قلم کان پر ایک جیب میں رکھے۔ مٹی کی دوات ہاتھ میں لئے چند میلے کاغذوں کو بغل میں دابے کونے کونے "رولر سگریٹ" کی خالی ڈبیاں ڈھونڈھتے ہوئے اڈے کو چلے پہلے توصفائی کی امین کچہری کے شیڈ میں سے ٹوٹی ہوئی جھاڑو لی اور اپنے اڈے کو جھاڑا اور پھر اُسے رکھکر پھٹی ہوئی شطرنجی جو دو فٹ مربع ہوگی ذرا جھٹکی گئی اور اس سے کسی قدر بوسیدہ بوریہ کا ٹکڑا لیکر اڈے کو سنوارا اِدھر اُدھر سے دو چار پتھر ارے لاحول ولا پیپر ویٹ لیکر بیچ میں رکھدیا خود چار مینار کے کٹھہرے[ل] کو ٹیکا دیکر بیٹھ گئے پہلے ایک نظر دونوں طرف ڈالی "وزیر علی بادشاہ" کی ڈیوڑھی کے دروازے کو گھورا۔ "علی میاں" کے چائے خانے کو للچائی نظروں سے دیکھا۔ اور پھر ایک لمبی نظر میداں خاں کے چوک کا نٹرے جعفر علی کے تابوت۔ بلکہ مال والوں کی ڈیوڑھی تک ڈالی۔ ایک

[ل] اللہ بخشے عالم آرائش بلدہ والوں کو انہوں نے یہ کٹہرہ اکھیڑ کر پھینک دیا اور اب منشی جی کی پیٹھ کا یہ سہارا جاتا رہا۔

ٹھنڈی سانس لیکر جیب سے رقعات عنایت علی نکالا۔ اس پر کچھ کاغذ رکھکر ایک کونے پر رکھدیا۔ اور اوس کے اوپر قدرتی پیپرویٹ اس کے جواب میں دوات اور جیب میں کا "بروکا قلم" اور "چاقو" بیچ میں کندھے سے رومال اُتار کر رکھ چھوڑا اور لگے مراقبہ کرنے!

منشی جی ہمارے قدیم کرمفرما ہیں جس زمانہ میں کہ ہم ابتدائی تعلیمی مراحل "دھرم ونت اسکول" میں طے کر رہے تھے ہمیں گھر سے ایک کاپی دیجاتی تھی جس پر کلاس ماسٹر کے دستخط بقید تاریخ و وقتِ حاضری لینے کا حکم تھا۔ ابتدا میں تو ہمنے ماسٹر صاحب کے دستخط لئے۔ مگر تابہ کے۔ آخر روز کی حاضری اور پھر وقت کی پابندی کس سے ہوئی ہے جو ہم سے ہوتی محرم کے پہلے ہفتہ میں ہم ایک روز بجائے اسکول کے "نتھو بیگ" کے رنگ میں حاضر رہے۔ مگر واپسی پر کاپی کے معرا ہونے کے خیال نے بیچین کردیا۔ اتفاقاً منشی جی کا خیال آگیا۔ ہم جلدی سے جا پہنچے۔ تاریخ وقت لکھوالیا۔ اور اُن کے دستخط بھی کرائے۔ گھر پر کہدیا کہ استاد بدل گئے ہیں۔ یہ نئے استاد کے دستخط ہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خدا سلامت رکھے منشی جی کو انہوں ایک مہینہ تک برابر دستخط کئے۔ مگر ہماری قسمت کو کیا کرتے گھر پر اطلاع پہنچی اور ہم پٹے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مگر منشی جی ہمارے پرانے شناسا تھے۔

جس زمانہ میں کہ ہم منشی جی سے ملتے تھے اُن کا روزگار خوب چلتا تھا

دفاتر کے رسائل۔ درخواستیں۔ عرضیاں۔ خطوط۔ منی آڈر فارم۔ اسم نویسی۔ رقعے غرض کے سینکڑوں چیزیں ان سے لکھوائی جاتی تھیں۔ حیدرآباد میں تعلیم کا چرچا کم تھا۔ خوش قلم عرضیاں۔ خوشخط درخواستیں۔ ٹائپ اور ترجمہ کے سائن بورڈ کہیں تھے ہی نہیں۔ مطبعے بھی اس کثرت سے نہ تھے۔ اور نہ وہاں کچّا خط لکھنے والے کاتب ہی تھے۔ دفاتر میں امیدواروں۔ عرایض نویسوں کی یہ کثرت نہ تھی۔ جو کچھ تھے یہی منشی صاحبان تھے جو چارمینار کے چاروں طرف دوزانو بیٹھے ہوئے تھے قلم دبائے ہوئے

پرسوں ہم "شاہ علی بنڈہ" کی طرف جارہے تھے مگر سرکار کی سواری شاید آنے والی تھی۔ روک ٹوک کی وجہ سے ہم نے تھوڑی دیر چارمینار کے گرد چکّر کاٹنا مناسب خیال کیا۔ پہلے تو حقیر فقیر پُرتقصیر ہیں نہیں۔ بلکہ محمد منیر الدین دنداں ساز کی دُکان اور چند ہوٹلوں کے بیرونی حصوں کا معائنہ کیا پھر ذرا آگے بڑھکر چارمینار کی خاص علامت "بلّی کے سر" پر غور کیا۔ اس کے بعد جو ادہر اُدہر نظر ڈالی تو منشی جی کو بھی اسی پرانی جگہ بیٹھے ہوئے بوریہ پر مصروفِ مراقبہ پایا۔ ہم نے کہا چلو انہیں سے گفتگو کریں۔ دیر تک پاؤں پٹکنے اور آواز دینے کے بعد منشی جی مراقبہ سے چونکے۔ نیم باز آنکھوں سے سرسری ملاحظہ فرمایا۔ اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ کہتے ہوئے مراقب ہوگئے ہم نے جو زور زور سے سائیکل کی گھنٹی بجائی تب کہیں انہوں نے سر اٹھایا اور آنکھیں چار کیں۔ کہنے لگے میاں!

آپ ہیں؟ میں سمجھا کوئی حضرت چھیڑنے کیلئے آگئے ہونگے۔ آجکل نوجوانوں نے
بہت ستانا شروع کردیا ہے۔ میں نے کہا منشی جی اب کیا حال ہے۔ کچھ ملتا
بھی ہے یا دن بھر اونگھا ہی کرتے ہو۔ کہنے لگے میاں کیا کہوں کوڑی کا کام
نہیں ہوتا۔ سامنے محلات کا دفتر تھا۔ وہ اب پنچ محلہ کے پاس چلے گیا۔ پڑھنے
لکھنے والے بہت ہو گئے۔ خدا بھلا کرے ان انگریزوں کا انہوں نے ٹائپ
نکال دیا۔ ٹائپ، اس سے تو ہم بے موت مر گئے۔ یہ پڑھے لکھے بچے مڈل
میٹرک پاس کر کے دکانوں پر بیٹھ گئے۔ آپ دیکھتے ہونگے نا۔ ایک صاحب نے
"ٹائپ اور ترجمہ کیا جاتا ہے" لکھ کر تختی ہی لگا دی ایک نے سبز رقم لکھکر لٹکا دیا
سب لوگ خوش قلم عرضیاں لکھنے لگے۔ مطبعے بہت ہو گئے۔ کاتب بھی اب
کاپی نویسی چھوڑ کر درخواست نویسی پر اتر آئے۔ بچہ بچہ لکھنے لگا سب تو
سب غضب خدا کا یہ ہے کہ عورتیں لکھنے پڑھنے لگی ہیں۔ کل کی بچیاں
خط لکھ لیتی ہیں۔ پہلے کے طریقے ہی نہ رہے۔ اسم نویسی مٹ گئی۔ اقرار
نامے تمسک نہ رہے۔ دیکھئے تو اب سفید کاغذ پر دولہا کا نام اس کے
باپ دادا ماں اور نانی کے نام اردو میں لکھ کر بھیجنے لگے۔ نہ وہ عبارت
آرائی رہی نہ وہ خاص سرخ کاغذ رہا۔ نہ وہ خاص مضمون ہی رہا
اب کی اسم نویسیاں دیکھئے نہ تو "بسم اللہ" نہ "نحمدہ لفضلی" غضب یہ کہ پہلے
اسمائے مستورات در پردۂ عصمت لکھ کر چھوڑ دیتے تھے۔ اب کے لوگ

پردے کی بیٹھنے والیوں کے نام تک لکھنے لگے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ بدل گیا۔ پہلے اسم نویسوں میں لکھا جاتا تھا کہ "ہر جا کہ خواہند دریافت فرمانید" اب سرے سے کچھ لکھا ہی نہیں جاتا۔ اجی دعوت کے رقعے دیکھئے سر نہ ٹانگ "لطیف الدین اور بیبی متمنی ہے کہ شرکت عقد و تناول طعام سے ممنون فرمائیں۔" ایک کونہ پر وقت۔ ایک جگہ مقام۔ بس رقعہ ختم۔ آپ ہی کہئے یہ کوئی دعوت کا رقعہ ہے۔ آیت نہ حدیث۔ قافیہ نہ ردیف۔ چار انگل کے اودے پیلے کارڈ پر بھونڈا مضمون چھاپ دیا۔ خطوں کو دیکھئے "مکرمی" "مشفقی" "محبی" تو اب ذرا معمر اور پرانے خیال کے لوگ لکھتے ہیں نوجواں تو بس "ڈیر" لکھکر چلے گھانس کترتے ہوئے۔ خط کیا لکھ رہے ہیں گویا بیجنامہ کر رہے ہیں۔!! حول ولا اب کہئے ہم جیسے بوڑھوں سے کون لکھوائے گا ہمارا پیٹ کیا چلیگا اب شریفوں سے تو ہم ہاتھ دھو بیٹھے۔ بیچارے غریب مزدور۔ پان سگریٹ والے کبھی کبھار خط کارڈ لکھوا لیتے ہیں اور دو پیسے ہم کو ملجاتے ہیں اگر یہ نہوتے تو ہم کبھی کے کہ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھے بھیک مانگتے نظر آتے یہ کہکر منشی جی آبدیدہ ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھر آئیں۔ پچکے ہوئے گال پھول گئے۔ ہاتھ میں رعشہ زیادہ ہو گیا۔ بہ ہزار دقت پھٹا ہوا رومال زانو کے نیچے سے نکالکر آنسو پونچھے اور ایک سرد آہ کھینچکر کہا "میاں ہم زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ مگر برے حالوں۔"

زن مرید

جہاں تک میں نے سنجیدگی سے غور کیا "زن مریدوں" کے اقسام حسب ذیل پائے گئے۔

(۱) اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے بیوی سے خوف زدہ رہنے والے

(۲) بیوی کے تمول یا اسکے والدین کے اثرات سے ڈرنے والے۔

(۳) بیوی کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر دبے رہنے والے۔

(۴) بیوی کی ضد، غصہ، ہٹ، یا تعلیم کی وجہ سے محکوم رہنے والے۔

(۵) خواہ مخواہ بلاکسی وجہ کے سہم جانیوالے۔

پہلے زمرے میں وہ لوگ شریک ہیں جو یا تو دائم المریض ہوں یا بقول بعض اشتہاری دوا فروشوں کے بچپن کی غلط کاریوں کی وجہ لطف زندگی کھو بیٹھے ہوں۔

دوسرے وہ جو "گھر داماد" ہوں یا بیوی کے روپئے پر گذر بسر کرتے ہوں

یا اوس کے والدین وغیرہ سے سفارش وغیرہ کی امید رکھتے ہوں۔

تیسرے وہ ہیں جو رفیق زندگی کی خوبصورتی پر بے طرح مرمٹے ہوں۔

چوتھے وہ گربہ یا گاؤ صفت بزرگ جو نہایت غریب / سادہ لوح / قدیم الخیال / کم تعلیم یافتہ غیر مستقل مزاج ہوں۔

پانچویں وہ حضرات جو مذکورہ بالا چاروں طبقوں سے بھی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر فطرتاً "پاپوش کاری" کیلئے بنائے گئے ہوں۔

میں ایک مدت سے اس پر غور کر رہا ہوں مگر اب تک کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور نہ امید ہے کہ کبھی سمجھ میں آئے گی۔ میں نے اکثر اصحاب کی طرز معاشرت پر غور کیا ہے بعض لوگوں کے حالات کسی قدر دلچسپ ہیں ممکن ہے کہ ان کو سنکر بعض احباب کوئی مستقل خیال قائم کر سکیں۔

میرے ایک ملاقاتی بہت مسن ہیں سن شریف دو بیس (۴۰) سے زیادہ ہے مگر ابھی تک بکمال انکسار اپنے آپکو کم از کم جوان تصور فرماتے ہیں و نیک بختو میر مومن کے دائرہ میں سلا چکے ہیں۔ اب تیسری کے دام زلف میں اسیر ہیں مگر اس بری طرح پھنسے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ بیوی سے اس قدر ڈرتے ہیں جس قدر کہ ایک بغدادی قاعدہ پڑھنے والا لڑکا اپنے میانجی یا اس مسجد کے ملا کی چھڑی سے ڈرتا ہو جہاں کہ وہ پڑھنے جایا کرتا ہے۔ یہ پہلے زمرے سے متعلق ہیں اور صرف یہی ایک ہی نہیں اس معزز طبقہ کے افراد ہیں جو میرے ملاقاتی ہیں

دوسرے طبقہ کے اکثر بزرگوں سے واقف ہوں۔ ایک بزرگوار ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر یعنی اپنی ماموں زاد بہن کے شوہر ہیں۔ بدنصیبی سے بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ ماموں ہی نے پڑھایا لکھایا اور نوکر رکھا دیا ان حضرت کی وقعت اپنی بیوی کے پاس وہی ہے جو ایک تانگہ والے کی پولیس کانسٹیبل کے پاس ہوتی ہے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ ہیں مگر بیوی سے اسقدر مرعوب کہ اگر وہ ہلدی کی گرہ کو "ہڈرو فلورک ایسڈ" کہدے تو یہ معمل میں جاکر ثابت کرنے کو تیار ہو جائیں گے کہ واقعی ہلدی "ہڈرو فلورک" ہے اور ایک صاحب جو اسی زمرے سے متعلق ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کے ممبر تو نہیں مگر اپنے خسر کے تمول کی وجہ سے اس قدر مرعوب رہتے ہیں کہ ان کے ملازمین نے کلکتہ کے گلشن سلیپر سے انکی چندیا کے بال نکلتے دیکھا ہے۔

تیسرے طبقہ کے لوگ اکثر ملتے ہیں۔ ایک میرے عزیز بلائے حسن میں اس قدر مبتلا ہوئے کہ جوتھی چالوں کے اندر ہی اندر ماں بھائی بہن سب کو چھوڑ چھاڑ کر نیک بخت کے ساتھ علیحدہ جا کر رہ گئے۔

اور ایک کرمفرما نے اپنے شوق ذوق کو محض اس لئے ترک کر دیا کہ انکی صاحب جمال رفیقۂ زندگی کی فرمائشات کی تکمیل کیلئے روپیہ کافی نہ تھا۔ اب وہ بجائے سینما دیکھنے کے صابن خریدتے ہیں۔ بجائے سگرٹ پینے کے پوڈر اور کریم لیتے ہیں۔ اور بجائے ہوٹل میں آئسکریم کھانیکے

بیوی کیلئے ساڑھی کی تو ریلیجاتے ہیں۔ اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ وہ کبھی ان عادات واطوار کے بھی تھے یا کیا۔ ایک زمانہ میں وہ دن بھر میں صرف دو وقت گھر جایا کرتے تھے مگر اب دن بھر میں ایک وقت بھی دس منٹ کیلئے گھر سے باہر نہیں نکلتے۔

ایک صاحب اس بُری طرح رتیجھے ہوئے ہیں کہ ایک روز کیلئے بھی کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو نیک بخت ساتھ ہوتی ہیں۔

جو تھے طبقے کے لوگ فی زمانہ ذرا کم ہیں۔ مگر قربان جائے خالق کے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے ایک مولوی صاحب جو نہایت ہی کم سخن متین سنجیدہ ہیں۔ اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی ان کے گھر پر ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ ان کو کم از کم دو روز تک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔

ایک بزرگ جبتک باہر رہتے ہیں چار چھ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں۔ مگر گھر میں کھانا کھانیکے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں۔ اس لئے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔

ایک صاحب کو بلا اجازت گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں۔ اگر اتفاقاً رات بھر غائب رہیں تو صبح داخلہ ممنوع۔ مگر یہ اس قدر متین آدمی ہیں کہ

"میلاد شریف" کی شرکت کی اجازت لیکر احباب کے ہمراہ تھیٹر اکثر دیکھ لیتے ہیں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے ملنے والوںمیں اس پانچویں طبقہ کے لوگ بہت ہیں۔ ایک کرمفرما جو ماموں زاد ایسوسی ایشن کے ممبر اور ریاضیات کے گریجویٹ ہیں۔ ایسے خواہ مخواہ ہیں کہ پوچھئے نہیں بفضلہ تعالےٰ گذشتہ چاروں طبقوں سے غیر متعلق مگر بے طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ ایک خط مستقیم کو زاویہ حادہ فرمادیں تو یہ جیومیٹری سے نہ سہی الجبرا ہی سے سہی مگر ثابت ضرور کر دینگے کہ زاویہ خط مستقیم ہے۔ دوسرے ایک بزرگ جو اسی ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں نہایت ہی پریشان رہتے ہیں اگر ان کے کسی عزیز کو ترقی ملتی ہے تو انکی نیک بخت دو ہتڑ چلانا شروع کرتی ہیں کہ دیکھو تمہارے فلاں عزیز کو ترقی ملی اور تم منہ دیکھا کئے تم بھی ترقی کرو مگر یہ بیچارے سوائے اس کے کہ اپنی سادہ لوحی میں ترقی کریں اور کچھ نہیں کرتے اور ایک بزرگ جو ایک معزز پیشہ کرتے ہیں اسی خواہ مخواہ میں مبتلا ہیں۔ انکی خزانہ دار بیگم صاحبہ ہیں۔ اگر کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو برآورد پیش کیجاتی ہے کہ کرایہ ریل، کرایہ تانگہ، حمالی اسٹیشن، سوڈا، سگریٹ، چاء، بچوں کے لئے کھلونے، اخبار یا بک سٹال پر سے کوئی ناول۔ مگر یہ مد باقی نہیں رہتی اور نہ ان کا تخمینہ ہی کام دیتا ہے۔ کرایہ ریل تو خیر جنتری میں دیکھ لیا جاتا ہے مگر غضب یہ ہے کہ اسپنسر کے سوڈے کے بجائے ڈالٹن کا سوڈا پینے کیلئے

ایک آنہ اور رفرشمنٹ روم کے بجائے گرم چاء پینے کیلئے ایک آنہ منظور ہوتا ہے
غور کیجئے بیچارے کس قدر معذور ہیں۔ ایک صاحب ہمیشہ بوتل بدست نظر
آتے ہیں۔ جب کبھی دیکھئے دواخانہ کی گیٹ پر موجود۔ اگر ڈاکٹر صاحب آپریشن
روم میں بھی ہوں تو یہ وہیں پہنچکر کیفیت سنانے لگتے ہیں "ڈاکٹر صاحب
سنئے تو سہی رات مکان میں طبیعت بہت خراب رہی مغرب کے بعد سے
دس بجے رات تک دو گلاس پانی پی گئیں۔ نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آئی
کروٹیں بہت بدلتی رہیں۔ چھ سات بار کروٹ بدلی ہونگی صبح بھی جلد یعنی
½ ۸ بجے بیدار ہوگئیں کہئے بخار تو نہیں ہوگا

اگر یونہی تفصیل لکھی جائے تو مشکل ہے۔ طلسم ہوشربا کی طرح کئی جلدیں
درکار ہونگی۔ میں انہیں فی الحال ختم کرتا ہوں مگر ایک بات پریشان کن یہ ہے
کہ بعض افراد دوسرے اور تیسرے چوتھے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر خوف
مطلق نہیں ڈرنیکا نام تک نہیں لیتے الٹے حکومت کئے جاتے ہیں۔ ذرا
غور تو کیجئے کہ یہ ہے کیا بات، کاش مولانا عبدالماجد اس طرف توجہ فرماتے
یا کم از کم پروفیسر سراج الدین صاحب شمیم کو تو ضرور متوجہ ہونا چاہئے۔

ایک صاحب جو میرے مخلص ہیں بیوی کے گھر پر رہتے ہیں۔ اسی کا
مال کھاتے ہیں۔ مگر اس حکومت اور شان کیساتھ کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ سالن
میں نمک زیادہ ہوجائے تو دسترخوان الٹ دینگے۔ مارے چیخوں کے گھر سر پر

اٹھا لیں گے۔ پان میں چونا بڑھ جائے تو سر کھا جائیں گے۔ بچی کے ہاتھ میں مٹھائی نظر آئے تو خود جھپٹ لیں گے۔ اور اگر وہ روئے تو ڈپٹ کر بڑھا دینگے۔ ان حضرت کا نام بدمذاقوں نے "ماٹھو" رکھا ہے مگر انکی شان اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے

ایک بزرگ اپنے خسر کا مال نہایت ہی بیدردی سے صرف کرتے ہیں جب کبھی ضرورت پڑتی ہے بے تکلف اپنی رفیقۂ حیات سے کہلوا کر منگوا لیتے ہیں مگر ان کا سیدھا ہاتھ ہمیشہ نیک بخت کی چوٹی ڈھونڈھتا رہتا ہے اور الٹا ہاتھ گال۔ کئی مرتبہ موقعِ واردات پر ہمیں بھی پہونچنا پڑا ہے۔

اور ایک حضرت بیوی کا جہیز اور زیور وغیرہ اپنے شوق و ذوق کی نذر کر چکے ہیں۔ بیچاری کو اسقدر وقعت دیتے ہیں جتنی کہ ایک سیول سرجن گاؤں کی دایہ کو

اور بھی اکثر اصحاب اسی قبیل کے ملتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بات ہے۔ ان رموز و غوامض کا پتہ اُسوقت چل سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی مردم شماری اسطرح کیجائے کہ "ڈرنے والے مرد" اور "نڈر مرد" علیحدہ علیحدہ شمار کر لئے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ڈرنیوالے اہنیں پانچ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا کیا۔ اور نڈر کتنے طبقوں پر منقسم ہیں۔ کم از کم ایسے مردوں کے دماغ خرید لئے جانے چاہئیں تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ انہیں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہے یا ان کے دل و جگر کا معائنہ کیا جانا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ایک نڈر کا دل ایک ڈرنیوالے کے دل سے کتنے گز لمبا یا چوڑا ہوتا ہے اور اسیطرح نڈر اور ڈرنیوالی

صنف نازک کے دل و دماغ کا معائنہ کیا جائے تو امید ہو سکتی کہ ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہونچیں۔

یا شادی شدہ لوگوں کا ایک کلب قائم کیا جائے اور سارے ہندوستان میں اسکے ماتحت ایک ایک کلب قائم ہو تو کچھ پتہ چلیگا کہ یہ ہے کیا بلا۔ اگر موقع ملے تو یہ مسئلہ مجلس متفقہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور فیصلہ سے متعاقب اطلاع دیجائیگی۔

عطردان

اپنا ولایتی عطردان دے دیا ہوتا سینٹ کی شیشی دیدیتے میرا عطردان کیوں دیا۔ تم کو میری چیزوں سے اتنی دلچسپی کیوں؟ اتنی دشمنی کس واسطے؟ بغض کس لئے؟ میں نے غلطی کی۔ ہاں ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ عطردان اندر سے بھجواتی ہی نہیں تو کوئی کیوں لیجاتا۔ مجھے کیوں ترسنا پڑتا۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر کیوں روتی۔ تم کو کیا تمہیں فکر کس بات کی۔ کسی نے مانگا اور تمنے دیدیا یہ تو کہو غیروں کے مال پر دیدے لال کرنے والے تم کون "؟

زہرہ بیگم دالان میں بیٹھی ہوئی گرج رہی تھیں۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ سارا بدن غصہ سے کانپ رہا تھا۔ بڑی بچی حیرانی سے منہ تک رہی تھی۔ بچہ اپنے ربڑ کے کبوتر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے کھڑا تھا۔ کبھی اپنی ماں کی صورت غور سے دیکھتا کبھی باپ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا اور کبھی بہن کو دیکھکر خاموش ہو جاتا۔ عابد صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سگرٹ تھا۔ مگر وہ پی نہیں سکتا تھا

غصہ، شرم، خجالت، نفرت، مختلف جذبات اس کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے۔ چہرہ بالکل زرد تھا۔ وہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے زہرہ بیگم کی زبان چل رہی تھی۔ اور وہ پرجوش لہجہ میں مسلسل تقریر کر رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں وہ مسافر تھے تو مسافروں کی طرح رہتے۔ چھ آنہ کی سینٹ کی شیشی خرید لیتے۔ چار شیشیوں والا عطر دان لے لیتے کیا انہیں دو روپیہ بھی نصیب نہ تھے تم دوست ہی تھے تو ایک عطر دان منگوا دیا ہوتا۔ میرا عطر دان انہیں دینا کیا ضرور تھا۔ ابھی وہ قائم مقام ہو کر آئے ہیں یا منصرم، تنہا ہوں یا زنانہ کے ساتھ۔ عید کو گھر جانے کی چھٹی ملے یا نہ ملے مجھے اس سے کیا کام مجھے کیا واسطہ۔ میرا عطر دان انہیں کیوں دیا جائے مجسٹریٹ ہو کر آئے کہیں سے دو روپیہ کا عطر دان تک نصیب نہیں اور سنو کہیں سے چار آنہ تولہ کا عطر بھی میسر نہیں آیا۔ میرا بھرا بھرایا عطر دان لیگئے۔ ایسا ہی لیجانا تھا تو خالی عطر دان لیگئے ہوتے۔ میں نے پرسوں ہی تو عطر منگوایا تھا۔ سولہ روپیہ تولہ والا عطر کبھی انہیں نصیب بھی ہوا ہوگا؟ دو دن اور صرف دو دن کیلئے، واہ اچھے آئے عطر دان مانگنے۔ میں پوچھتی ہوں آخر مجھ سے دریافت کیوں نہ کر لیا۔ اپنا عطر دان کیوں نہ دیدیا۔ میرے عطر دان سے کیا خصوصیت تھی باہر بیٹھکر لگے حکومت کرنے۔ عطر دان منگوایا میں نے یہ سمجھ کر بھجوا دیا کہ کسی کو دکھائیں گے۔ بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ کوئی ڈاکو آیا ہے وہ لے ہی جائیگا۔"

"یہ عطردان باواجان نے کریم نگر میں خاص طور بنوایا تھا۔ جالی کا کام کتنا عمدہ تھا۔ اندر کی مخمل کی گدی "مس پریرا" نے لگائی تھی۔ کتنا عمدہ مخمل تھا اس پر گوٹ کتنی اچھی تھی۔ ماموجان نے کتنے دنوں کے تقاضے کے بعد اس پر سونے کے پھول لگوائے تھے۔ پہلے وہ تین شیشیوں کا تھا۔ مگر میں نے چچا ابا سے کہکر بڑی شیشی منگوائی۔ انہوں نے بمبئی سے لادی تھی۔ کتنی اچھی شیشی تھی پورے چار تولے عطر کی تھی۔ اس پر طلائی کام کتنا اچھا تھا۔ مگر خیر وضع کی ایسی شیشیاں ملتی کہاں ہیں۔ اندر کا آئینہ کتنا خوبصورت تھا۔ اکبر نے اس پر بیل بوٹے بنائے تھے۔ میرا نام بھی اسی نے کھدوایا تھا۔ جب ان لوگوں کو معلوم ہوگا تو وہ برا نہ مانینگے؟ انہوں نے ایک چیز شوق سے لادی تھی۔ ان کا تحفہ بھلا میں کسی کو کیوں دیئے چلی تھی۔ مگر تم نے خیال تک نہیں کیا۔ تم کو اسی عطردان سے اتنی خصوصیت کیوں تھی۔ اپنا ولایتی عطردان چھ شیشیوں والا دیدیا ہوتا۔"

"کوشلیا کی تصویر انلارج کرنے کو دی ہے گیا ابتک لا رہا ہے۔ ہوئی پان کی ڈبیہ کی بھی کچھ حقیقت ہے وہ بھی ایک صاحب مانگ لیگئے۔ کتابیں سینکڑوں چلی گئیں ابتک واپس آرہی ہیں ایسے دوست بھی کسی کے ہونگے۔ جو لیگئے لیگئے واپسی کا نام تک نہیں۔ وہ بیچارہ عطردان الگ لیگیا۔ آخر میرے بھی لڑکیاں ہیں۔ مجھے بھی اپنی لڑکی کا جہیز جوڑنا ہے میں تارتار کرکے جوڑوں اور تم لوگوں کے حوالے کردو، داماد آئیگا تو منہ پر نہ تھوکے گا؟ نواب کے بیٹے خود جاگیردار

پھر مہتمم پانچسو روپیہ تنخواہ اور جہیز میں بیٹی کو کیا دیا، چند انگریزی رسالے۔ دو چار پرانی کتابیں۔ چند تصاویر۔ بس یہی کائنات بھلا ایسے شخص کی بیٹی کون بیاہیگا؟

"کل عید ہے نواب زین الدین خاں کی بیوی ضرور آئینگی۔ ناظم صاحب کی بہن کا آنا لازمی ہے۔ تعلقدار صاحب کی بیوی کو میں نے دعوت دی ہے اور سب عورتیں آئینگی۔ تمہارے دوستونکی سب بیبیاں آئینگی۔ انہیں کیا دونگی وہ عطردان نہ دیکھ کر کیا خیال کرینگی۔ حضرت عباسؑ کی قسم میں تمہارے عطردان کو ہاتھ نہ لگاؤنگی۔ اس کی چھاؤں تک نہ دیکھونگی۔ اُس کو اندر نہ لانے دونگی۔ اپنا اچھا خاصہ عطردان دیکر لوگوں کا عطردان میں کیوں لوں۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ سب آئینگی اور یوں ہی چلی جائینگی۔ کسی کو عطر نہیں ملیگا وہ کیا خیال کرینگی۔ یہی نا بدنامی ہوگی۔ ہونے دو۔ تمہارا ہی نام بدنام ہوگا۔ تمہیں کچھ تو سزا ملنی چاہیئے۔ تم ایک دن گھر لٹا دوگے۔ اِن دوستونکے پیچھے برباد ہو جاؤگے بچی کے ایرنگ ٹوٹے پڑے ہیں۔ تین دن سے کہہ رہی ہوں مگر کوئی سنتا نہیں۔ تمہیں بچی کی کیا فکر۔ تمہیں گھر کا کیا خیال۔ تم کیوں یاد رکھوگے۔ تمہیں کلب کی فکر رہے گی۔ تمہیں دوستوں کا خیال رہے گا۔ عید آئی تو عطردان اور وہ بھی لوگوں کا بے مانگے بلا پوچھے دیدوگے۔ تمکو بچی سے کیا واسطہ کیوں خیال رہنے لگا اگلے سال وہ آئے تھے کوئی خان بہادر غنیمت یہ کہ انہیں رہنے کو مکان مل گیا۔ بیچارے نے دو آنے کا تو ادو پیسے کا چمٹا تک نہیں خریدا ہمارے

گھر سے تو گیا۔ میرے جہیز کا ڈنر سٹ کتنا نفیس تھا رکابیوں پر حضور کی تصویر کتنی اچھی تھی۔ سب پھوٹ پھاٹ کر رکابیوں کے چار ٹھیکرے دو ڈش ہی تو رہ گئے تھے۔ خان بہادر نے وہ تیس بار خانی دکھائی کہ انہیں سے بھی دو دو رکابیاں ایک ڈش توڑ کر بھیجا۔ ایسا ہی کوئی پاپڑ توڑ کر خان بہادر بنے ہونگے اے تم نے قدر دانی نہیں کی صاحب سے کہکر اب بھی کوئی اے بی۔ سی ڈی کا خطاب ہی لا دیا ہوتا۔ آخر تین برتن شہید کئے تھے۔ کوئی ٹھٹھا مذاق نہ تھا میرا سٹ خراب ہو گیا تمہاری جوتی سے۔ میری رکابیاں پھوٹ گئیں تمہاری بلا سے۔ میری ڈش ٹوٹ گئی تمہیں پروا نہیں ہوئی تمہیں فکر تو بس دوستوں کی ہے میرا عطر دان اٹھا کر دے دیا۔ اب کی دفعہ کوئی چیز دیکر تو دیکھو۔ علمبردار کی قسم تمہارا کالا ڈریس فقیر کو دیدونگی۔ بلٹ باؤلی میں نہ پھنکوا دیا تو زہرہ نہ کہنا کرچ کو چولھے میں نہ لگا دوں تو سہی۔ آخر کوئی حد بھی ہے۔ دیکھو نا اچھا خاصا عطر دان اٹھا کر دیدیا۔ اب وہ ضرور واپس کرینگے۔ یقیناً لا دینگے۔ گر پڑ کر چنچے کا نہیں بے احتیاطی سے آئینہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔ مخمل پر عطر کے دھبے کبھی نہیں گرینگے۔ شیشی واقعی سلامت آئیگی۔ عطر تو خرچ ہی نہ ہوگا۔

" اس مردوے سے عطر تک خریدا نہ گیا۔ اسی منہ پر تم کہہ رہے تھے علیگڈھ کالج کے بی اے ہیں۔ مجسٹریٹ ہو کر آئے ہیں۔ جوبلی میں ملاقات ہوئی تھی بڑے شریف ہیں۔ اللہ اللہ علیگڈھ کالج کے بی۔ اے عطر دان ہی مانگتے پھرتے ہونگے۔

مجسٹریٹ ہو کر آئیں بھی تو عطرداں مانگینگے۔ جوبلی میں بھی کسی کا عطردان چرائے گئے ہونگے۔ شریف آدمی جوتے تھوڑا ہی چراتے ہیں۔ صرف عطردان مانگ لیجاتے ہیں"

عابد کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ وہ بدقت اُٹھ کر اپنے ڈرائنگ روم تک پہنچ سکا۔ وہاں بھی اسے اپنی بیوی کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ آرام کرسی پر بلا ارادہ بیٹھ گیا۔ خود بخود پاؤں سیدھے ہو گئے اور پیٹھ کرسی سے لگ گئی۔ اُسے نیند آگئی اور خواب دیکھنے لگا کہ دنیا ایک بہت بڑا عطردان ہے۔ آسمان آئینہ بنا ہوا سر پر ہے۔ بڑے بڑے پہاڑ مخمل کی گدّی معلوم ہو رہے ہیں اور وہ کمرخی شیشی بنا ہوا بیچ میں بیٹھا ہوا ہے۔

خوب صاحب ! بات کا بتنگڑ بنا دیا ۔ لعاد

بدحواسی

حضرت آزاد[1] بھی عجیب بزرگ ہیں، چونکہ ہم سے خلوص ہے اور ہماری مالی حالت سے واقف ہیں۔ اسلئے اکثر ہمارے فائدے پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ آج مکتبہ[2] میں بیٹھ کر آپ نے بکمال متانت "معاوضہ مضامین" پر گفتگو شروع کی دیر تک نصیحت فرماتے رہے کہ معاوضہ لیکر مضامین لکھو، ہم اس کے خلاف ہیں نہ تو ہم اردو پریس کی حالت اتنی اچھی پاتے ہیں کہ وہ معاوضہ دے سکے اور نہ ہم "بہ ایں مفلسی" اس قدر گئے گذرے ہیں کہ معاوضہ لیں بہر حال دیر تک مباحثہ ہوتا رہا، لوگ مدلّل اور غیر مدلّل تقریر پر غور نہیں کرتے گرج دار آواز، تیز و تند لب و لہجہ، اور بھاری بھرکم الفاظ سے بہت مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری مدلّل مگر ضعیف و ناتوان، منحنی، تقریر پر کسی نے

---

[1] محمد مرزا خانصاحب آزاد۔

[2] مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

کان ہی نہیں دیا، خدا رکھے جناب آزاد ہیں بھاری بھر کم مردِ متین، الفربہ خواہ مخواہ ہٹیلے آدمی، آواز گرج دار لہجہ تیز و تند، توند کا پھیلاؤ، ہاتھوں کا بڑھاؤ، مونچھوں کا رعب، یہ سب چیزیں اِن کے ساتھ تھیں۔ عبدالرحمٰن صاحب بھی انہی کی گانے لگے۔ اور تصدق حسین صاحب بھی ساتھ ہو گئے۔ بیچارے عبدالحق صاحب[1] کبھی کبھی ہماری کمزور، ناتوان، ضعیف، زار و نزار رائے سے اتفاق کر لیتے مگر دل سے نہیں، صرف آزاد صاحب کو ستانے! دو گھنٹے یہی دردِ سری رہی معلوم نہیں اپنے مقصد میں کون کامیاب رہا۔ مگر ہم گھر پہونچکر اس خیال میں محو ہو گئے کہ میدان ہم نے مار لیا اور حضرتِ آزاد بھی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جیتا وہ تو کہاہے ناکہ، ہر کس بخیال خویش خبطے دارد،

فطرت نگار مہاشے سدرشن بڑے گپّی ہیں انکی گپیں (افسانے) بہت مقبول ہیں ہم آتے آتے ایک جلد لیتے آئے تھے۔ کھانا کھا کر لگے مطالعہ کرنے سدرشن جی نے خوب افسانے لکھے ہیں "بہارستان اور چندن" دونوں کو ہم نے دیکھا نو بجے سے دو بجے تک کرسی پر پڑے دیکھا کئے۔ جب دونوں کتابیں ختم ہو ئیں تو ہم نے ان پر تنقید شروع کی "محبوبۂ فرعون" بڑی عمدہ گپ تھی ہم اسکی تعریف میں اس قدر رطب اللسان ہوئے کہ تین بج گئے ساڑھے تین بجے رات کو الارم بجا ہماری نیک بخت برابر کے کمرے میں سو رہی تھیں شاید بیدار ہو ئیں تو ہمیں

---

[1] جناب محمد عبدالحق صاحب ڈائرکٹر و منیجر مکتبہ ابراہیمیہ

پہلو میں نہ پایا بس پھر کیا تھا برس پڑیں آگ لگے ان کتابوں کو اور خدا کی سنوار اس مطالعہ پر ساڑھے تین بج گئے مگر آپ ابھی مطالعہ فرمارہے ہیں، افیونی کی افیون چھوٹ جائے، حافظ کی نماز قضا ہو مگر آپکے ہاتھ سے کتاب نہ چھوٹیگی ایسے کتابوں کے رسیا دیکھنے میں نہیں آئے۔ آدمی کیا جھینگر ہیں کہ دن بھر کتابیں چاٹا کرتے ہیں۔"

ہم نے سگرٹ جلالیا اور دونوں ہاتھوں سے لگے میز پر طبلہ بجانے مگر گراما فون چلتا رہا۔ ہزاروں صلواتیں اڑیں، سینکڑوں پھبتیاں کسی گئیں مگر ہم ٹس سے مس نہ ہوئے، آپ شاید ہم کو صرف "رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور "جامعہ معارف" ہی کا ممبر تصور کرتے ہیں۔ اجی حضرت! اس کے علاوہ بھی ہم کو ایک اور اعزاز حاصل ہے وہ یہ کہ ہم "ناموں زاد ایسوسی ایشن" کے ممبر یعنی "ناموں زاد بہن کے شوہر ہیں"۔ اور وہ بھی "نان ریسی ڈونٹ" یعنی اپنے گھر پہ بیوی کو رکھنے والے نہیں۔ "ریسی ڈونٹ ممبر" یعنی "خانہ داماد" ہیں اس اعزاز کے ہاتھوں ہم آئے دن پریشان رہتے ہیں۔ ہماری عزت سسرال میں اوسیقدر ہے جس قدر سائمن کمیشن والوں کی ہندوستانیں!

"وہ "صلواتیں سنا کر چلی گئیں، ماماؤں اور چھوکریوں کو پکار پکار کر جگایا۔ اور لگیں بیچ صحن میں کھڑی ہو کر چیخنے، چلانے، ممانی نے انگڑائی لی، ماموں لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھتے ہوئے اوٹھ بیٹھے، بچے بوڑھے سب ہی

جاگ پڑے، کھانسنے، کھنکارنے کی سُریلی آوازیں ہماری سامعہ نوازی کرنے لگیں، ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ جاکر چارپائی پر لد گئے اور رضائی اوڑھ لی اور روزے کی فلاسفی، تراویح کی برکت نماز کی ضرورت کو سوچتے ہوئے سو گئے خبر نہیں کتنی دیر سوتے رہے دیکھتے کیا ہیں کہ وہ نہایت ہی پیار سے گلے میں باہیں ڈال کر کہہ رہی ہیں "دیکھو تم روزہ نہ رکھو" مگر اسی وقت ہماری ران میں درد ہونے لگا۔ آنکھیں کھلیں تو "وہ" کھڑی نظر آئیں اور اسی دلگداز آوازیں سحری کی دعوت دے رہی تھیں، اللہ کتنا اچھا خواب تھا، واقعہ تو یہ ہے کہ وہ خواب ہی میں کچھ اچھی طرح ملتی ہیں۔ ورنہ ظاہرداری کو کیا کہوں بقول حسن بن صباح کے ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، ہماری ظاہرداری کے باطن وہ خواب ہیں جو رات بھر ہمیں نظر آتے ہیں جن میں ہماری نیک بخت بڑی خیرخواہ نظر آتی ہیں اور نہایت ہی محبت سے ملتی ہیں، ورنہ ظاہر میں تو سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں، ہم اُٹھ بیٹھے جلد جلد منہ دھویا تھا اور نے دسترخوان بچھا دیا، ابھی ہم بال ٹھیک کر رہے تھے کہ نیک بخت نے دسترخوان پر دھاوا بول دیا اور لگیں چیخنے اجی! کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے سحر تو کر لو، پھر دن بھر بن سنور لینا' اب آپ کون سے سدی منبر بازار جا رہے ہیں جو اس قدر بناؤ چناؤ ہو رہا ہے بیچاری عورتیں بناؤ سنگار کیلئے بدنام ہیں مگر مردوں کو کوئی کہتا نہیں۔

ڈاڑھی ہی بنانے میں دو گھنٹے لگا دینگے آدھے گھنٹے تک مونچھیں

برابر کریں گے، پھر کریم ملنے کو ایک گھنٹہ لیں گے، پوڈر کو پندرہ منٹ ضرور لگیں گے۔ منہ دھونے بیٹھیں تو خیر سے ایک گھنٹہ صرف کریں گے پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے بال پونچھ رہے ہیں اس سے فارغ ہوئے تو لگے بال سنوارنے اللہ اللہ بالوں کی خاطر تو گھنٹوں تک زحمت اٹھائیں گے تم لوگوں کی مانگ سیدھی ہونے تک ہماری کھجوری چوٹی تیار ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی ہم بدنام ہیں۔ چھوڑو بھی بناؤ سنگار عورتوں ہی کو زیبا ہے اور پھر ان عورتوں کو جو ہوائی دیدہ ہوں یا بازار کی بیٹھنے والی ہوں۔ ہم نے تو شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کو کبھی بنتے سنورتے نہیں دیکھا"

یہ باتیں سنکر ہم آگ ہی تو ہو گئے مگر کرتے کیا ع بر سر دامادِ آدم ہرچہ آید بگذرد، کہکر کنگھا رکھ چھوڑا، برش پھینک دیا تولیہ کندھے پر ڈالکر دسترخوان پر آ بیٹھے۔ بھوک تو خاک نہ تھی مگر تھوڑا بہت زہر مار کر کے اٹھ کھڑے ہوئے میز پر "مرزائی کوک شاستر" یعنے بہشتی جھومر رکھی ہوئی تھی اسی کو دیکھنے لگے مرزا صاحب پہ بہت غصہ آیا کہ انہوں نے کتاب بعد از وقت لکھی کاش یہ کتاب ہماری نیک بخت کے بچپن میں لکھی جاتی اور وہ بچپن ہی میں اسے پڑھتیں کچھ نہ کچھ اثر تو ہوتا اور ہمکو ذرا اطمینان تو حاصل ہوتا۔ مگر مرزا جی نے بدقسمتی سے لکھی بھی تو کب جبکہ خیر سے وہ دو بچوں کی ماں ہو چکیں تھیں، اور ہمیں دی بھی تو کب جبکہ "وہ" لڑنے میں طاق، اکڑنے میں شہرہ آفاق، جھگڑنے میں مشاق

ہو چکیں تھیں۔ اس وقت یہ کتاب کیا فائدہ پہونچاتی وہ تو کہا ہے نا!

چوب تر را چناں کہ خواہی پیچ

وہ کھا چکیں تو چائے بنائیں مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پیالی ہماری طرف بڑھا دیتیں، کالی کلوٹی بجّا والے پیالی ہمارے سامنے رکھدی اور ہم نے پہلا گھونٹ پیا، چائے اچھی تھی مگر اپنی تین صفتوں یعنے لب بند، لب ریز، لب سوز، میں صرف درمیانی صفت سے بھری ہوئی تھی۔ شکر تو نام کو نہ تھی اور اس قدر سرد تھی کہ آگے چلکر شربت بادام کا گمان ہونے لگا تھا۔ مگر کرتے کیا شکر مانگنا دوسرے معنی میں اپنھی ہونے کا اعلان کرنا تھا۔ اور ٹھنڈی ہونے کی شکایت کرنا گویا شامت بلانی تھی، بھلا اب کس کی ہمت تھی جو انکی وچپپ تقریر سنتا ہم نے "یہ از شیر مادر" سمجھکر اسی پیالی کو ختم کیا، اور سگرٹ جلالیا بدقسمتی سے پان بھی نہیں نصیب ہوا۔ مانگنا ہماری وضعداری کے خلاف تھا۔ کرسی کے نیچے لونگ پڑا ہوا نظر آیا۔ ہم نے اس کے قریب سگرٹ گرادیا اور پھر جھک کے سگرٹ کے ساتھ لونگ بھی اٹھالیا، اور لگے چبانے۔

"وہ" جاکر اپنی والدہ کے پاس بیٹھی رہیں، ختم سحر کی توپ دغی، کلّیاں غرارے، شروع ہوئے، دیر تک وہ متبرک آواز آتی رہی اوّل کلمہ طیب کی گونج سنائی دیتی رہی مگر ہم سگرٹ پر سگرٹ جلاتے رہے۔ واقعی اسپورٹس من ہوتا بھی اچھا سگرٹ ہے۔

صبح کے چھ بجے وہ کمرے میں آئیں تو ہم نے سگرٹ پھینک دیا اور لگے "تذکرۂ اولیا دکن" دیکھنے انہوں نے تیکھی چتوں سے ہماری طرف دیکھا اور اور جا کر چارپائی پر دراز ہوگئیں، دو منٹ کے انتظار کے بعد ہمنے سگرٹ جلا لیا اور لگے نظام گزٹ کیلئے گپ لکھنے ابھی ایک صفحہ بھی نہ ہوا تھا کہ پردہ ہٹا اور وہ برآمد ہوئیں ہم نے لاکھ چاہا کہ سگرٹ چھپا لیں مگر ممکن نہ ہوا، دھویں نے بھانڈا پھوڑ دیا اب کیا تھا اُف......" اچھا آپ میں یہ عادت بھی ہے شرم نہیں آتی۔ ہمارے ساتھ سحری ہوتی ہے ہمارے ساتھ افطار اور پھر آپ الگ الگ سگرٹ بھی اڑاتے ہیں میں سحر کرکے سو جاتی ہوں تو آپ سگرٹ پیا کرتے ہیں۔ اسی لئے تو دن بھر آپ گھر پر نہیں رہتے اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ دنیا میں ہیں اللہ میاں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور ہم کو بھی تُف ہے تمہاری زندگی پر لعنت ہے ایسی"..... ہم سمجھ رہے تھے کہ مارچ بینڈ بج رہا ہے اور بالا گھاٹ کی بے برگ و گیاہ وادیوں سے گذر کر راہ تیر کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھیک بارہ بجے ہم ڈبل مارچ میں مصروف ہیں۔

جسوقت ہماری آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے تین بج چکے تھے، کمرہ کرۂ نار بنا ہوا تھا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا ہمارے برابر وحید الزماں صاحب ندوی فنا فی النوم تھے، سارا گھر سنسان تھا کبھی کبھی کسی کوے کی بے ہنگام آواز البتہ سنائی دیتی تھی، گھڑیال کی ٹک ٹک سخت وحشت انگیز تھی ہمنے سگرٹ جلایا منہ دھوئے بغیر شیروانی پہن لی گپ کا مسودہ جیب میں رکھا اور چلے "دفتر نظام گزٹ"

چارلی چپلن کا تماشہ

خدا جنت نصیب کرے والدِ مرحوم کو وہ فرمایا کرتے تھے کہ "انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو فوج میں نوکر ہوتا ہے" مگر یہ کلیہ ہماری نظر میں تو ذرا ٹیڑھا اترتا ہے ہم تو کہتے ہیں کہ "انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو گھر داماد ہوتا ہے"۔

خدا غارت کرے اس خانہ دامادی کو ہم نے دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھکر یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ہم بھی خانہ داماد بن جائیں تو خوب گذرے گی۔ مگر لاحول ولا سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ "ماٹھو" پر ہم فقرے کستے تھے۔ عنایت خاں پر پھبتیاں اڑاتے تھے۔ تقریباً سب گھر دامادوں کی دُرگت بناتے تھے مگر ہمیں کیا معلوم تھا محاورہ کہ ایک روز ہم بھی گھر داماد بنینگے۔ اور گیدڑ کی طرح کیچڑ میں پھنس کر رہ جائینگے۔ ہائے بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

پرسوں ہم کو "چارلی چاپلن اِن گولڈ رش" دیکھنے کی سوجھی بعض احباب سے ملتے ملاتے تھیٹر پہنچے تو سات بج رہے تھے کھیل شروع ہو کر آدھ گھنٹہ گذر چکا تھا

ہم نے سوچا کہ چلو کسی اور جگہ بیٹھ رہیں۔ سیکنڈ شو دیکھ لینگے۔ اب جو آکر ملٹی ریٹورنٹ میں قیام کیا تو ملگئے حضرت سعیدی اور حضرت قریشی۔ حضرت آزاد وغیرہ۔ ساڑھے نو بجے تک علامہ سنلائٹ کا ذکر ہوتا رہا حضرت کی خانگی ہسٹری بچوں کی لائف انکی مضمون نگاری۔ اور سرقہ شعاری۔ حوالہ نویسی غرض ہر چیز پر مکمل اور مبسوط لکچر دیا گیا۔ پھر ہم چلے طرف سینما کے۔

گو شدت کی بھوک تھی مگر چارلی چاپلن کے نام نے تھوڑی دیر کیلئے معدے کو بھی مرعوب کر لیا۔ دس بجے سے ہم نے سینما دیکھنا شروع کیا تو بارہ بھی بج گئے۔ اور ساڑھے بارہ ہوتے آئے خدا خدا کرکے ہال سے نکلے۔ بھوک سے یونہی بُرا حال تھا۔ چاپلن کی مضحک حرکات پر ہنس ہنس کر آنتوں میں درد بھی مول لیا اب جو سائیکل وصول کرنا چاہتے ہیں تو "سائیکل بان" یعنی محافظ سائیکل نے سائیکلوں کو ایک دیوار سے اس طرح جمایا تھا کہ پہلے کسی ایک شریف آدمی کی بائیسکل تھی۔ اس کے اوپر ہماری اور ہماری سائیکل کے اوپر پوری پچاس سائیکلیں۔ ہر شخص آتا اپنا ٹکٹ دیتا۔ اور نمبر وار سائیکل لیجاتا۔ ہم نے شمار کرنا شروع کیا۔ ۵۲۔ ۵۱۔ ۵۰۔۔۔۔۔ ایک بجے کہیں نمبر ۲ آیا ہم نے جھٹ سے ٹکٹ پیش کیا اور سائیکل لیکر چلے گھر کی طرف رسی ڈولنی کی موٹر پر ایک موٹر سے معانقہ کرتے کرتے بچے۔ گولی گوڑہ کے چمن[۱] کے پاس ایک سائیکل سوار سے گلے مل ہی لئے اور پتھر گھٹی پر ایک لڑکے کو

---

[۱] آرائش بلدہ کی ہوا نے اب اس چمن کو اڑا ہی دیا۔

"ضربِ خفیف نہ شدید" بلکہ سائیکل کی ٹکّر دیتے ہوئے چار مینار تک آ گئے۔
میداں خاں کے چوک کے کتّے بھی غضب کے ہیں۔ جعفر علی کے تابوت کے پاس سے
جو ہمارا خیر مقدم شروع کیا تو بس کوٹلہ کے دروازہ تک پہنچا کر چھوڑا۔ خیر یہ گذری کہ
کوٹلہ کے والنٹیر بھی ہمارے منتظر ہی تھے۔ پہلے تو انہوں نے خوش آمدید کہا اگر
ہمارے پیچھے اس "والنٹیر کور" کو دیکھ کر دست و گریباں ہو گئے ہم نے جو ایک
لانبا سانس لیکر سائیکل بڑھائی تو سیدھے گھر پر .... پھاٹک پر پہنچکر سائیکل
دیوار سے لگائی۔ کان دھر کر آہٹ جو لی تو رستم علی کے خرّاٹوں کی آواز سنائی
دینے لگی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کڑک کر آواز دی "رستم علی رستم۔ رستم ایک سانس
میں تین دفعہ پکارا۔ تب کہیں رستم علی نے کروٹ لی اور اپنی پینک کی رسیلی آواز
سے پوچھا "کون ہے رے" ہم نے کہا "بھئی میں ہوں" خیر یہ گذری کہ حضرت
سمجھ گئے۔ جلدی سے کھولدیا پھاٹک ہم نے اندر آ کر دیکھا تو اندر کا دروازہ بھی
بند۔ اب کیا کرتے اگر آوازدیں اور کچھ شور و شغب ہو تو زنانہ تک آواز جانے کا
اندیشہ رستم علی سے کہا کہ بھئی تم ہی کسی کو پکارو اور اپنے لئے کہکر دروازہ کھلواؤ
وہ غریب اِن خانہ داماوی کے جھگڑوں کو کیا جانے کڑک کر آواز دے ہی دیا کہ
"دلاور دروازہ کھولو دولہا میاں آ گئے" خیر دلاور نے دروازہ کھولا۔ ہمارے ہاتھ سے
سائیکل لی۔ اور ہم داخل ہوئے۔ اب جو ہم دیکھتے ہیں تو زنانہ دروازہ بند!
غضب خدا کا ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہم نے پہلے تو چار لی چاپلین کی شان میں

کچھ مغلظات کا استعمال کیا۔ پھر اُس سائیکل بان کو مخاطب کرکے کچھ سنایا سینما والے کو بھی نہ چھوڑا مگر فائدہ کیا تھا۔ آستین چڑھا کر سیدھے ہاتھ سے زنانہ دروازے کی کنڈی کھولنی چاہی۔ دیر تک کوشش کرتے رہے مگر ممکن نہوا دلاور کھڑا تماشا دیکھا کیا جب ہم نے ہار مان لی اور دروازہ کے پاس سے ہٹ گئے

تو اُس نے آگے بڑھکر ایک ذرا سے جھٹکے میں کنڈی کھولدی جھٹ سے ہم داخل ہوگئے اور آہستہ سے دروازہ کی کنڈی چڑھا کر اپنے کمرے کی راہ لی خیر یہ گذری کہ پاؤں میں کریب سول شوز تھا۔ آواز بھی نہ ہوئی کمرے میں آکر شیروانی ٹوپی۔ شوز۔ پاتابے اُتارے۔ سگرٹ جلا کر سونے کے کمرے کو دیکھا تو بیگم صاحبہ نہایت ہی فراغت سے سو رہی تھیں۔ باہر آکر نعمت خانہ ٹٹولا کہ کچھ بسکٹ کیک یا میوہ ہی مل جائے مگر سوائے خالی برتنوں شکر اور چاء کے کچھ ملا ہی نہیں۔ بھوک اس شدت کی تھی کہ سر چکرا رہا تھا۔ ٹول پر پاؤں رکھ کر ہم نے سوچا کہ کیا کرنا چاہئے۔ مگر کوئی بات ذہن میں نہ آئی۔ بیگم کو جگانے کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً ابجا اور کو ڈھونڈھا۔ بڑی دیر کے بعد پتہ چلا کہ وہ باورچی خانہ کے سامنے دالان میں ماؤں کے ساتھ سو رہی ہے مجبوراً پاؤں دبا کر وہیں پہنچ گئے جوانی کی نیندیوں ہی بری ہوتی ہے اور پھر دن بھر کام کاج دوڑ دھوپ کرکے تھکنے کے بعد تو پوچھئے نہیں۔

کچھ ایسی سوئی تھی سونیوالی کہ جاگنا حشر تک قسم تھا

مونڈھا تھام کر دیر تک جھنجھوڑا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ مگر ہوشیار ہوتا کیا معنی ظالم کروٹ بھی لینے کو تیار نہ تھی۔ آخر ہم نے تنگ آ کر ناک کے دونوں نتھنے ہاتھ سے پکڑ لئے۔ سانس جو رکنے لگا تو اُسے کہیں ہوش آیا۔ چونک کر ادھر اُدھر دیکھکر ہم سے مخاطب ہوئی اور خاموشی سے گھورنے لگی۔ ہم نے منہ سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہو تو آہستہ سے کھانے کیلئے کہیں مگر ادھر ہم نے ہاتھ کھینچا اور ادھر اُس نے ہاتھ جھٹک کر کسیقدر بلند بلند آواز میں کہا "واہ میاں راتوں کو آ کر جگانا کیا بات بیگم صاحب سنینگی تو غضب ہو جائیگا جا کر سو رہیئے۔" ہم نے دبی آواز میں کہا "بختاور ذرا اُٹھ تو سہی" اب تو اُس نے اور بھی پاؤں پھیلائے لگی کڑکنے "واہ میاں واہ یہ بھی کوئی بات ہے" ہم نے دیکھا کہ معاملہ اگر بڑھے تو مشکل ہے خاموشی سے واپسی کی ٹھان لی۔ اُس کا ہاتھ چھوڑ کر چلے۔ اب جو پلٹتے ہیں تو دیکھتے کیا ہیں کہ بیگم صاحبہ ہمارے پیچھے پورے جلال کے ساتھ کھڑی ہوئی ہیں۔ چہرہ انگارے کی طرح سُرخ نتھنے پھُولے ہوئے آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ سینہ متلاطم سانس پھُولا ہوا ہماری روح ہی فنا ہو گئی۔ کئی ایک آیتیں پڑھیں "جلّ تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کیا اور ڈرتے ڈرتے کہا "بیگم!" بس برس ہی تو پڑیں وہ وہ صلواتیں سنائیں ہیں کہ معاذ اللہ۔

مہو شوہر کوئی بیوی کے بس میں

اِس قدر گرجدار آواز تھی کہ سارا گھر جاگ اٹھا۔ ہم نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ کم از کم اپنے کمرے تک پہنچ جائیں مگر ممکن نہ ہوا۔ بیگم نے ایک قدم آگے بڑھنے نہ دیا۔ مامائیں۔ چھوکریاں۔ چھوکرے سب جمع ہو گئے کسی نے یہ اور غضب کیا کہ جا کر ہماری سالیوں اور خوشدامن صاحبہ کو جگا دیا۔ بڑی بی بھی پہنچیں۔ اب گویا ہم ملزم بنے کھڑے تھے۔ مامائیں گواہ تھیں۔ بیگم صاحبہ مدعی اور ہم ملزم بڑی بی نے بختاور تفصیل پوچھی۔ ماماؤں سے گواہی طلب کی بیگم صاحبہ کا بیان سُنا۔ مگر ہمارا ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہ ہوا۔ خدا بھلا کرے ہماری منجھلی سالی کا اُس غریب نے سب کو ہٹایا۔ ہم سے پُوچھا کہ ہے کیا قصہ ہم نے بکمال معصُومیت آنکھوں میں آنسو بھر کر تمام تفصیل سنائی۔ اس بھولی بھالی لڑکی کو تو یقین آگیا۔ مگر ہماری بیگم نے باضابطہ جرح شرُوع کر دی۔ سوال بندی تو ترتیب دے دیا کہ

(۱) اگر بہت بھوک لگ رہی تھی تو ہمیں جگا دیا ہوتا۔

(۲) ہم سے ایسی محبت تھی اور ہماری نیند خراب کرنا پسند نہ تھا تو کسی ماما کو جگا دیا ہوتا۔

(۳) آہستہ سے بے پاؤں جا کر خاموشی سے بختاور کو جگانا اور اس کے بیدار ہونے پر ہاتھ پکڑ کر کھینچنا کیا بات تھی۔

(۴) اگر کوئی خاص بات نہ تھی تو دندناتے ہوئے آکر آواز سے جگایا ہوتا۔

اس قدر آہستگی اور کانا پھوسی کیا ضرور تھی۔"

(۵) "اپنا پمپ شوز نہ پہننا اور ہمارا سلیپر سونے کے کمرے میں سے لیکر پہننا کیا ضرور تھا۔"

(۶) "کندھے پر تولیہ ڈالکر بختاور کے پاس آنا کیا بات۔ ورنہ غسل خانہ کو بھی خود تولیہ لیجانے کی عادت نہ تھی۔"

(۷) "بختاور کو جگانے کے بعد بجائے کھانا لانے کے لئے کہنے کے اٹھنے کی فرمایش کرنا کیا بات؟"

(۸) "آواز دیکر جگانے یا جھنجوڑنے کے بجائے نتھنے پکڑ کر جگانا کیسا؟"

(۹) "دلاور نے دروازہ کھولا تو اسی کو کھانا لانے کیلئے کیوں نہ کہدیا؟ بختاور کے پاس آنا کیا ضرور تھا۔"

یہ سوالات ایسے نہ تھے کہ ہم بلا کسی بیرسٹر یا جوڈیشل کامیاب وکیل درجہ اوّل یا ال ال بی، کی امداد کے جواب دیکتے۔ ہم نے منجھلی سالی کے کمرے کا رُخ کیا اور اُسکی چارپائی پر گر کر اپنی معصومیت پر اشکباری شروع کی۔ سحر کی ٹھنڈی ہوا نے خالی معدے اور تھکے ہوئے دماغ کو کچھ اسقدر متاثر کیا کہ نیند آگئی۔

بوکھلاہٹ

گذشتہ صبح کو ہم سویرے ناشتہ کرکے گھر سے نکلے، ملتے ملاتے پھرتے پھراتے بارہ بجے مکتبہ ابراہیمیہ پہونچے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عبد الحق سے گپ لڑائی اور پھر چلے طرف قطبی گوڑے کے، چونکہ ہم روزانہ دفتر جانے کیلئے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کرتے اور بڑی بے دردی سے خوب ڈٹ ناشتہ ہوتا تھا۔ اسلئے دفتر میں ڈیڑھ دو بجے تک بھوک نہیں لگتی تھی۔ مگر تعطیل کے روز چونکہ دوپہر کا کھانا گھر پر کھانے کا اتفاق ہوتا اس لئے ہم ناشتہ بھی ذرا معمولی اور یونہی سا بقدر بادام یعنی صرف ایک پراٹھا۔ آدھ پاؤ کھچڑی معہ سالن کھالیا کرتے تھے اور فقط ایک عدد پیالی پی جاتے اور سات بجے تک تیار ہو کر گھر سے چلے جاتے تھے اس لئے راستہ میں لگنے لگی بھوک ہم نے کہا آؤ ذرا چائے پی لیں، "بمبئی رسٹارنٹ" میں پہونچکر چائے پی کچھ بسکٹ کھائے اور پھر سائیکل سنبھالی تو سیدھے "حافظ جی" کے مکان پر جا ٹھہرے کئی روز کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

ادھر اودھر کی باتیں، شکوے شکایت، طنز، چوٹ، مذاق، دل لگی، سبھی کچھ ہوتا رہا حتی کہ بج گئے ساڑھے چار! ہم نے سوچا کہ کھانے کا وقت تو گیا اب گھر جا کر کھانا کھائیں گے تو پوچھ گوچھ ہوگی کہ اب تک کہاں رہے دیر کیوں لگائی وقت پر کیوں نہیں آئے؟ لہٰذا اس سے بہتر یہی ہے کہ رات ہی کو گھر پہونچکر کھانا کھائیں اور دوپہر کے کھانے کے واسطے یہ کہکر ٹال دیں کہ عبدالحق نے مجبور کرکے کھانا کھلا دیا، یہی سوچکر ہم نے پانچ بجے بمبئی رسٹورنٹ میں چائے بھی پی لی اور پہونچ گئے مکتبہ ابراہیمیہ وہاں دیکھتے کیا ہیں کہ "مخزن کا افسانہ نمبر" اسٹال پر رکھا ہوا ہے اب جو خوشی خوشی ہم نے رسالہ لیکر دیکھا تو سب سے پہلے ہمارے مشترکہ ترجمے "آرٹسٹ" پر تنقید نظر آئی شروع سے اخیر تک پڑھ ڈالا ایک نہیں دو دو بار دیکھا مگر سوائے برائیوں کے اچھائیاں نظر ہی نہیں آئیں میاں[۱] تاثیر نے فقط معائب ہی معائب گنائے تھے اور آخر میں یہ تاثر لکھ دیا کہ "کتاب تک پھینک دی" ہم نے کہا چلو یہی غنیمت کہ تاثیر صاحب نے کتاب پڑھ کر پھینکی بات دراصل یہ ہے کہ اردو مرکز والے اب ذرا سمجھنے لگے ہیں۔ اپنے تئیں "یا آپ نے سمجھے ہوئے ہیں"۔

آسکر وائیلڈ کی نثر انگریزی میں وہی درجہ رکھتی ہے جو میر انیس کی نظم کو اردو میں حاصل ہے اگر کوئی شخص میر انیس کے مراثی کا ترجمہ انگریزی

۱۔ محمد دین صاحب تاثیر، ایم، اے

میں کرے تو کیا اصل کا لطف باقی رہے گا؟ مطلق نہیں اطرز بیان کی ایک خصوصیت اور تشبیہ و استعارات کی لطافت ایک حد تک معلوم ہوسکیگی اور بس یہی حال اسکر وائیلڈ کے ڈراموں کا ہے اُدھر انہیں اُڑادیا" (اردو میں ترجمہ کیا) اور ادِھر لطافت غائب پھر آپ ہی کہئے ہم اصل کی خوبی کہاں تک باقی رکھ سکتے تھے خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا مگر ہمیں مسرت ضرور ہوئی کہ تاثیر صاحب نے اس کا مطالعہ اصل کو پیش نظر رکھکر کیا ہے اس تنقید کو ختم کر کے افسانوں پر پہونچتے ہیں تو بس امتلا اور سخت امتلا شروع ہوجاتا ہے کوئی ناظمی صاحب خیر سے ایم اے بھی ہیں اور روسی افسانے کو ہندوستانی فضا میں ترجمہ کرتے ہیں۔ مگر واہ ری تاثیر کی آپ بُرا تو نہیں منائیں گے" اور تم جوان ٹھیرے ہرگز نہیں میں بھی خاموشی پسند ہوں یا تو نی ہرگز نہیں" میکسم نے امن کا سانس لیا کوئی بڑا جرم کیا ہے تم نے جو یوں خاموش ہر وقت ضمیر کی ملامتیں سنتے رہتے ہو، میں یہ کہکر خوشی خوشی بستر میں جا کو دا گم ہو جاؤ نہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔" رفیق اطاق" کیا کیا ترکیبیں گنواؤں بقول مرحوم مہدی کے " امتلائے ادبی" پیدا ہونے لگا۔ اور ہمنے یہ جملے سنائے مکتبہ ابراہیمیہ کے منیجر عبدالحق صاحب کو گو آدمی ذرا سیدھے سادھے ہیں اور فی الجملہ سادہ لوح بھی واقع ہوئے ہیں مگر ایک بات ضرور تیتے کی کہی کہ بعضی لوگوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ مگر دوڑتے ہیں دوسروں کی

آنکھ کا تنکا نکالنے ڈھائی صفحے کے ترجمہ میں ایک ایم اے نے معمولی جملوں کے لکھنے میں اتنی بدحواسیاں کیں مگر پروفیسر تاثیر یا حضرت حفیظ کو نظر ہی نہیں آئیں اور جو تم نے سوا سو صفحے کی ادبی ادق اور اہم کتاب کے ترجمے میں اگر غلطیاں کیں تو بس سر ہو گئے" ہمنے کہا میاں جانے بھی دو ایسا ہوا ہی کرتا ہے یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت مولوی محمد عبدالوہاب صاحب قبلہ داڑھی کھجلاتے اور توند ہلاتے ہوئے آہی پہونچے پھر کیا تھا گپ شروع ہو گئی۔ اسی اثناء میں چراغ علی صاحب بھی ہانپتے ہوئے بٹوا سنبھال کر آدھمکے اور طائفہ وزراء ان عرب کے ارکان اربعہ نے وہ وہ گپیں اڑائیں کہ واہ میاں باقر علی داستان گو کی روح بھی شرما گئی ہو گی۔ اسی گپ بازی میں ساڑھے سات بج گئے، چراغ علی ٹھہرے "وہ" یعنی بمحاورۂ عوام زن مرید" سائیکل سنبھالکر سیدھے گھر کی طرف جاتے رہے اور ہمیں وہاب نے دعوت دیدی ہم نے بھی عبدالحق کے اصرار پر دعوت قبول کر لی اور چلے طرف نام پلی کے پیٹ بھر کھایا اور پھر لب بند، لب سوز، لب ریز، چائے پی اور ساڑھے آٹھ بجے واپس ہوئے۔ مالگزاری کے سامنے پہونچکر عبدالحق چلتے بنے اب صرف رہ گئے ہم دونوں یعنی وہاب اور راقم جانب! وہاب نے کھانا ہضم کرنے کی ترکیب یہ نکالی کہ شاہ[۱] صاحب کے پاس چلیں اور وہاں مرزا صاحب کے مزاج

---

[۱] شاہ عبدالقادر صاحب خلف نواب جعفر یار جنگ بہادر

پوچھیں ہم دل میں توڈر رہے تھے کہ نہ جانے، گھر جانے کے بعد کیا گت بنتی ہے
مگر ہمت کر کے شاہ صاحب کے پاس چلنے کی ٹھان لی اور وہیں پہونچے مرزا صاحب
پاندان لئے براجمان تھے۔ شاہ صاحب بھی تشریف فرما تھے، نظامی صاحب
بھی موجود تھے۔ ہمارے پہونچتے ہی جلسہ کا ملہ کمل ہو گیا اور سب ملکر ہل پڑے
مرزا صاحب! مرزا صاحب کی مختصر تعریف یہ ہے کہ پرانی دلی میں پیدا ہوئے
دیسی ریاستوں اور خاصکر رامپور میں جوانی گذاری اور پھر دکن آکر نوکری کرلی
ابتداً تلنگانہ میں رہے پھر حیدرآباد میں قیام فرمایا چار شادیاں کیں پہلی بیوی
میرزا صاحب سے ڈیوڑھی عمر کی چھ بچوں والی ملی جسوقت مرزا صاحب سے
نکاح ہوا تو اُن محترمہ کے بڑے صاحبزادے جو مرزا صاحب ہی کے ہم عمر تھے
تکمیل تعلیم کیلئے یورپ جا رہے تھے۔ دوسری شادی بھی ایک چار بچوں
والی ہی سے کی اور تیسری چوتھی بھی، میر منشی گیری رزیڈنسی سے لیکر آبکاری
کی داروغہ گیری، اور محبس (جیل) کی محرری تک کی مگر پاؤں میں چکر تھا کہیں
ٹکے نہیں سن شریف ستر کے قریب ہے بال سفید ہو گئے ہیں جسم خاصا
بھاری بھر کم ہے رنگ بھی سرخ و سفید پایا ہے۔ خضاب لگا کر اب بھی مونچھ
چڑھائے پھرتے ہیں۔ اس حالت میں بھی جوانوں سے گئے گذرے نہیں۔
کسی بات کا تذکرہ ہو بینک سے چونک کر خود بھی شریک ہو جاتے ہیں وہی
روز پہلے میرزا صاحب نے نواب معین یار جنگ کے پاس دعوت اڑائی تھی

اور اب بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے تھے حق تو یہ ہے کہ حقِ نمک خواری ادا کرتے تھے تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے ہم جو پہونچے تو ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ لگے بغلیں جھانکنے گو مذاق کرنا جانتے نہیں۔ مگر بامذاقوں کی صحبت ضرور ملی ہے اور اسی برتے پر چند خاص خاص جملے بول بھی لیتے ہیں مگر وہیات میں رہ رہ کر زباں اس قدر خراب ہو گئی کہ لاحول ولا قوۃ، ساڑھے گیارہ بجے رات تک سبھوں نے میرزا صاحب کو ستایا۔ بیچارے دن بھر کے تھکے ہوئے افیون کھا کر سونا چاہتے تھے گھڑی گھڑی پینک میں چلے جاتے تھے اودھر انہوں نے آنکھیں بند کر کے غوطہ لگایا اور ادھر سبھوں نے چیخا "بُرتی بُرتی" جھٹ میرزا صاحب چونک پڑے اور لگے اناپ شناپ بکنے۔

ٹھیک بارہ بجے ہم ٹیلیفون ایکسچنج کے پاس پہونچے نہایت تیزی کیا تھا چلے جا رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی اب جو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو مولوی سردار علی صاحب مدیر رسالہ تجلّی سہ ماہی (جو تقریباً ایک سال سے زیر اشاعت اور آدھے سے زیادہ لکھا جا کر رکھا ہوا ہے[۱]) ڈنڈا ہاتھ میں لئے جھومتے ہوئے آ رہے ہیں مولوی صاحب اتفاق سے ہمارے استاد بھی واقع ہوئے ہیں اور والدِ مرحوم کے شاگرد بھی اور پھر علمی ادبی آدمی بھی اب اگر ہم نہ ٹھہرتے تو مشکل تھی مجبوراً سائیکل سے اتر کر ملنا پڑا، ادبی دنیا، نیرنگِ خیال،

[۱] افسوس ہے کہ رسالہ تجلّی کا یہ آخری پرچہ تھا اس کے بعد قصہ ہی ختم ہو گیا۔

نگار، سے لیکر معارف تک کے متعلق آپ نے پوچھ لیا اور پھر پیک سائنس رہبر دکن، مشیر دکن، صحیفہ، صبح دکن، نظام گزٹ، دکن گزٹ[1]، دکن پنچ سے لیکر الحمایتہ تک کے متعلق فرما دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے رسالے کی اشاعت کا تذکرہ، کاپی نویسوں کی شکایت مطبع کی مذمت بھی فرماتے رہے بہرحال گول بنگلہ سے سوکھے حوض تک حضرت نے خراماں چلتے ہوئے دنیا بھر کی باتیں کیں اور پھر کچھ نہیں ہمنے انہیں رخصت کرکے چار مینار کی گھڑیال پر نظر ڈالی تو چھوٹا کانٹا بارہ اور ایک کے درمیان میں نظر آیا اور بڑا کانٹا فقط دس پر یعنے ایک بجنے کیلئے صرف دس منٹ باقی تھے، ہمنے سائیکل پر سوار ہوکر بھاگنا شروع کیا تو سیدھے گھر پہونچ کر دم لیا۔ پھاٹک کے سامنے سائکل کو دیوار سے ٹیکا دیکر کھڑا کردیا اور بڑی دقت سے ہاتھ ڈالکر پھاٹک کھولا مگر ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑیال کا آئینہ شہید ہوگیا اور اندر جاکر پھاٹک بند کیا اور دیوان خانے کے دروازہ کو بھی ہاتھ ڈالکر کھولنے کی کوشش کی بڑی دقت کے بعد دروازہ کھلا اور ہم نے دالان میں سائیکل رکھکر جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو، پڑھتے ہوئے دبکتے دبکاتے ڈرتے سہمتے اندر کا رخ کیا، صحن میں پہنچکر دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے کمرے میں خاصی روشنی ہے چراغ جل رہا ہے بیگم صاحبہ لکھنے کے میز کے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں بس ہمارے اوسان ہی

---

[1] یہ روزنامہ بھی چند ہی دن جاری رہ کر بند ہوگیا۔

خطا ہو گئے۔ ہمنے کہا کہ آج خیر نہیں۔ پھر یہ سوچا کہ آہستہ سے پیچھے جا کر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر دیں گے۔ اس مذاق ہی سے سہی مگر ذرا غصّہ تو ٹھنڈا پڑیگا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پاؤں میں ایڑی دار شوز تھا۔ ہم نے اس خیال سے کہ آواز ہو گی اس کو اُتار کر صحن ہی میں چھوڑ دیا اور ننگے پاؤں دبکتے دبکتے کمرے کے پچھلے دروازہ سے داخل ہونا چاہا، ہائے دنیا کی بدترین چیز موز ہے صورتاً برا مزا خراب، خاصیت خراب، مضر صحت، قابض، جانے کیا اور کیا اور پھر اس بڑے میوے کے چھلکے (پوست) بھی تکلیف دہ! نہ جانے کس نے موز (کیلے) کھا کر سیڑھیوں پر چھلکے (پوست) پھینک دیئے تھے کہ ہمارا سیدھا پاؤں اسی پر پڑا اور ابھی ہم سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دھڑام سے دروازے میں گر پڑے پردا لٹک رہا تھا بدحواسی میں ہم نے اسی کو تھامنا چاہا تو وہ بھی سر پر آ رہا۔ اب ہماری ہئیت کذائی ایک گٹھری سی بنگئی اور ہم پردے میں لپٹے لگے لوٹنے ادھر جو بیگم صاحبہ نے دروازہ میں سے کسی گٹھری کو گر کر حرکت کرتے دیکھا تو انکے ہاتھ پاؤں بھی سرد ہو گئے، زور سے چیخ کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے ادھر چیخ کی آواز پر سب لوگ جاگ پڑے، بجتا ور ایک طرف سے دوڑی۔ انا بھی آنکھیں ملتی ہوئی آ گئی۔ کاماٹن نے بھی کمرے کا رخ کیا، بجتا ور کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ ہم اُٹھ بیٹھے مگر پاؤں ابھی پردے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر اس لونڈیا کو بھی بے اختیار ہنسی آ گئی اور وہ لگی کھل کھلا کر

ہمنے اس آواز پر بیگم صاحبہ نے ایک ہاتھ آنکھ پر سے ہٹا کر جو ملاحظہ فرمایا تو ہم گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے اور بختاور ہنستی ہوئی نظر آئی بس اب کیا تھا غریب بختاور کی شامت ہی تو آگئی فونٹن پن سوان انک کی شیشی میز پر سے اٹھا کر بختاور پر کھینچ ماری مگر اتفاق سے وہ تو بچ گئی لیکن شیشی دیوار پر لگ کر ٹوٹ گئی اور روشنائی دیوار سے اچھل کر ہمارے منہ سر اور چھاتے پر افشاں کی صورت میں آرہی۔ بال بھی سرخ ہو گئے اور گال پیشانی آنکھ، ناک بھی لال لال ہو گئے تھوڑی دیر پہلے تک مارے ڈر کے ہمارا برا حال تھا مگر اب ہمیں بھی غصہ آگیا اور ہمنے بھی یہی سمجھا کہ کچھ ہو آج بیگم صاحبہ کو کم از کم دو تمانچے رسید کر دینے چاہئیں ہم اس مارنے کے ارادے یا مارنے کے خیال یا مارنے کی غرض سے یا مارنے یا مارے جیسا کرنے یا مارنے کی نیت سے ابھی قدم بھی اٹھانے نہیں پائے تھے کہ انا نے کمرے میں قدم رکھا اور ہمیں سر سے پاؤں تک سرخ سرخ دیکھ کر اسے خون کا شبہہ ہو گیا اور وہ لگی چیخنے "ہائے دولھے پاشا وائے دولھے پاشا اللہ اللہ منہ سب خون میں بھر گیا منہ سب خونا خون ہو گیا۔ اس منظر کو کاماٹن نے دیکھا تو اسے کچھ اور تو سوجھا نہیں لگی وہ ڈاڑہیں مار مار کر رونے اس تعزیہ داری کی شرکت کیلئے گھر بھر کی حاضری ضروری تھی ہماری دونوں سالیاں اپنے اپنے کمروں سے دوڑتی ہوئی آئیں ممانی (خوشدامن) بھی ہانپتی ہوئی آپہونچیں، اور پھر ماموں جان بھی پریشاں ارگنگ (تہمد)

باندھے کنٹوپ اوڑھے ٹھوڑی کے نیچے ہیٹ کی تسمے کی طرح کنٹوپ کے بند باندھے ہوئے سرہانے سے پیش قبض اٹھا کر آ پہونچے، ماما ئیں بھی جاگ پڑھیں۔ ہمارے کمرے میں پہونچکر بڑے میاں نے انتہائی سراسیمگی سے پوچھا کیا ہوا بیٹا؟ ہم اس میں شک نہیں بوکھلائے ہوئے ضرور تھے مگر واقعہ بیان کرنے کے سوا چارہ کیا تھا ہم نے کہا جی کچھ نہیں سُرخ روشنائی گر گئی بڑے میاں نے آگے بڑھکر غور سے چہرے کو دیکھا اور نہایت ہی متانت سی پوچھا وہ کس طرح اب ہمنے بکمال مظلومیت سارا قصہ سنایا کہ ہم پچھلے دروازے سے اس طرح آرہے تھے اور یوں پاؤں پھسلا اور ہم پردے میں لپٹ کر اس طرح گرے اور بیگم صاحبہ نے چونک کر ایسی چیخ ماری اور بجنا ور یوں دوڑتی ہوئی آئی اور اس طرح ہم اٹھ رہے تھے کہ وہ ہنسنے لگی اس پر خفا ہو کر بیگم نے یوں سیاہی کی شیشی پھینکی اور وہ شیشی دیوار پر یہاں لگ کر ٹوٹی اور اسکی سیاہی یا سرخی یا روشنائی اس طرح ہماری سرخروئی کا باعث ہوئی اور اتا نے خواہ مخواہ رونا شروع کیا" بڑے میاں تو خیر سارا قصہ خاموشی سے سنکر مسکراتے ہوئے پلٹ گئے مگر دونوں لڑکیوں (سالیوں) نے ہنسنا شروع کیا اور بڑی بی نے دونوں ہاتھوں سے چٹ چٹ بلائیں لیکر سیکڑوں دعائیں دیں اور لگیں تحقیقات کرنے کہ کس نے موز کا چھلکا سیڑھیوں پر پھینکا وہ تو ہم نے ہوشیاری کی جو بڑی بی کو باتوں میں لگا کر

دالان تک پہونچا دیا ورنہ صبح تک بھی موز کے چھلکے کی تحقیقات ختم نہ ہوتی ہمارے واپس آتے ہی دونوں سالیوں نے انگلیاں مٹکا مٹکا کر گانا شروع کیا ع ہم بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گئے۔

ہمنے ان شیطانیوں سے پیچھا چھڑانا ہی مناسب جانا اور آہستہ سے غسل خانے کی راہ لی، وہاں پہنچکر شیروانی اتاری، صابون لگا لگا کر سر اور منہ دھونا شروع کیا۔ سر تو صاف ہو گیا مگر سرخروئی نہ گئی، لال لال دھبے گالوں اور پیشانی پر باقی رہ گئے۔ صابون سے بیسن سے گھسنی سے ہر چیز سے رگڑ رگڑ کر ان دھبوں کو نکالنے کی کوشش کی لیکن ؎

سرخی کے نشان گئے نہ رُخ سے
ناحق دو گھنٹے شست و شو کی

آخر تھک کر ہم نے یہ شست و شو ختم کی اور کمرے میں آکر دیکھا تو بیگم صاحبہ بڑے ٹھسّے سے تیوری چڑھائے پیشانی پر ہزاروں شکن ڈالے ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا میز پر رکھے ہوئے ہمیں گھور رہی تھیں مارے غصّے کے کندنی رنگ اور چمک اٹھا تھا۔ سانس زور زور سے لے رہی تھیں سینے کا تموّج بھی بڑھ گیا تھا۔ اس "بدرِ چرز" کو دیکھ کر ہم ساری کلفت بھول گئے بے تحاشا آگے بڑھکر۔۔۔ ہائیں ہائیں۔۔۔ بس غضب ہی ہو گیا وہ تو صبح سے بھری بیٹھی تھیں برس پڑیں اور لگیں لتھاڑنے گویا ہتیار موزی کی اصطلاح میں

مذاکرۂ علمیہ بپا ہو گیا۔

"بس دور ہی رہو صبح ساڑھے سات بجے سے گئے ہوئے آئے ہیں رات کے دو بجے غضب خدا کا اکیس گھنٹے مزے میں گزار دیئے اور خبر نہ ہوئی بیوفائی کی انتہا بھی ہے ہمنے آپکے کارن آپا بسرا دیا مگر آپ ہیں کہ دوستوں میں گرفتار نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے رہے کہ صبح کے گئے اب آ رہے ہیں اور آئے بھی تو اس مردار بجنا ور کے پاس نہ جانے کب سے پڑے ہوئے تھے جب جی بھر گیا تو اُسے لیکر میرے پاس وارد ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ اس نگٹی کلموہی سے نہ جانے کیا محبت ہو گئی ہے کہ دن رات اسی کا کلمہ پڑھا جاتا ہے صبح سے شام تک بس بجنا ور کا وظیفہ ہے کام کہیں گے تو بجنا ور کو ہنسیں گے تو اسی کے ساتھ گھل مل کر باتیں ہونگی تو اسی سے انعام دیں گے تو اسی کو تعریف ہو گی تو اسی کی تائید کرینگے تو اسی کی میں کہتی ہوں کہ آخر اس سے ایسی ہی مُحبّت ہے تو نکاح کیوں نہیں کر لیتے اسی کو ساتھ لیکر خوشی خوشی زندگی بسر کرو اور خوش رہو میں منع تھوڑا ہی کرتی ہوں تم یا مذیوں ہی سے خوش ہو تو انہیں کے ساتھ رہو کہنے والا کون ہے، پرسوں خالہ امّاں کے ہاں نیاز میں جاتی ہوئی میں اس مردار کو بھی ساتھ لئے جا رہی تھی۔ امّا جان نے ناحق روکا اب جو واپس آکر دیکھتی ہوں تو اور ہی عالم ہے کلموہی نگٹی مردار پٹیاں سنوارے اچھلتی کودتی پھر رہی ہے اس کے انداز دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ نہ کچھ

بھید ہے اب جو کمرے میں آکر دیکھتی ہوں تو پلنگ پوش پر سلوٹیں پڑی ہوئی
ہیں سرہانے کے تکئے میں اس مُردار کے سر کے ناریل کے تیل کی بو بسی ہوئی
ہے۔ کمرے کی چاندنی پر اس کے پاؤں کے بیسوں چھاپے پڑے ہوئے ہیں
میں گئی تھی بارہ بجے اور آپ صبح کچہری جا چکے تھے آکر دیکھتی ہوں تو تھے نہیں
میرا یہ خیال ہوا کہ ابھی کچہری سے آئے نہ ہونگے وہی مُردار آکر لوٹی ہوگی مگر
رستم سے پوچھتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ حضور دو بجے تشریف بھی لائے تھے۔
پانچ بجے تک کمرہ بند کئے .... رہے میرے آنے سے پہلے باہر
تشریف لیگئے اور پھر سب کو منع بھی کر دیا کہ دیکھو گھر آنے کی اطلاع بیگم صاحبہ
کو نہ دینا، رات کے نو بجے آتے ہیں تو ایسے غریب جیسے کچھ جانتے ہی نہیں
نہ تو اپنے آنے کا تذکرہ کرتے ہیں اور نہ میرے جانے کی وجہ پوچھتے ہیں اور میں
جو نیاز میں جانے کا قصہ سناتی ہوں تو حضور کو تعجب بھی ہوتا ہے۔ اچھا تم
ہو آئیں، کہکر اظہار تعجب بھی کرتے ہیں، اُف رے تیری عیاری خدا نے مرد بنایا
سو یہ حال ہے۔ اگر عورت ہوتے تو نہ معلوم "کلیوپٹرا" کا نام زندہ کرتے کہ "سلومی"
کے جانشین ہوتے پیر زن، فرہاد کش، بنتے کہ عورت ڈلا کہلاتے"

گذشتہ جمعرات کو دن بھر غائب رہے رات بھر غائب رہے جمعہ کے
روز تشریف لاتے ہیں تو اس ہیئت کذائی سے کہ شیروانی میلی قمیص اور پاجامے
پر رنگ برنگ کے دھبے چہرا اترا ہوا، آنکھیں سُرخ سُرخ خمار آلود، ہونٹوں پر

پیٹریاں جمی ہوئیں چلتے ہیں تو عجیب انداز سے ایک طرف قدم رکھتے ہیں تو ایک طرف پڑتا ہے کہنا کچھ چاہتے ہیں منہ سے نکلتا کچھ ہے آتے ہی غسل کیا اور پھر پڑ کر سو رہے تو چار بجے تک۔ جب کہیں آدمی نے پوچھا تو وہی کہا کہ دوستوں نے مجبور کر کے اپنے ساتھ حمایت ساگر کھینچ لیا تھا رات بھر جاگتے رہے نیند کا خمار تھا۔ اسی لئے آکر سو رہا، مجھے اس پر بھی شبہ نہیں ہوا، دستی سونگھتی ہوں تو آمیں مصالحہ کی بو بسی ہوتی، بیچارے اُن کے دوست مصالحہ شیروانی میں ملتے ہوں گے۔ یا ڈاڑھی مصالحہ سے دھوتے ہونگے پوچھا تو کہا کہ عبدالحق کا بچہ منظور انّا کی گود میں بیٹھا میری دستی سے دیر تک کھیلتا رہا اسی انّا کے سر کے مصالحہ کی بو ہو گی بھلا غور کرنے کی بات ہے کہیں انا مائیں بھی سر میں مصالحہ اور عمر خیام آئل ڈالتی ہیں جو دستی میں بُو بسے، اسپر بھی میں خاموش ہو رہی مگر پرسوں معلوم ہوا کہ حضرت نے اپنے "دزدانِ عرب" یعنے دوستوں کے ساتھ جلسہ منایا ہے خدا اِن دوستوں سے سمجھے وہ بیچارے مولوی[۱] صاحب کتنی مقدس صورت کے بزرگ ہیں۔ ڈاڑھی دار آدمی ٹخنوں سے اُوپر پاجامہ شرعی مونچھیں شریفانہ، صورت بالکل مُولویانہ مگر کن چال ایسے کہ بس کہے نہ جا سکیں، سنا کہ بیچارے صبح چھ بجے گھر سے نکل کر رات کے بارہ بجے پہونچتے ہیں اور بیچ میں بھٹک کر نہیں دیکھتے بیچاری بیوی گھر میں پڑی کڑھا کرتی ہے

---

[۱] مولوی عبدالوہاب عقل مند

دھوپ ہو، بارش ہو جاڑا ہو کچھ ہو مگر مولوی صاحب کے اس معمول میں فرق نہیں آتا، یہ بھی کوئی زندگی ہے وہ عبدالحق صاحب اتنی بڑی فرم کے مہتمم ہیں سنتی ہوں کہ بڑے منتظم اور بیوپاری دماغ کے آدمی ہیں اور پھر بیوی سے بھی ڈرتے ہیں مگر ان لوگوں کا ساتھ دینے سے باز نہیں آتے اسی محبت نے ان کی مٹی بھی پلید کی عبدالرحمٰن تو آپ کے بچپن کے ساتھی ہیں مگر اب کچھ ان کا ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ بیچارے نہایت کم سخن منکسر مزاج غریب طبیعت کے آدمی ہیں گھر سے نکلے دفتر گئے اور دفتر سے نکلکر سینما پہونچے پھر گھر جاکر پڑ رہے۔ مگر کبھی کبھار بڑی سرگرمی سی انکی پارٹیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بیچارے اللہ والے آدمی ہیں مگر ان کو بھی رنگ پر لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں میرزا صاحب ہیں کہ بھٹر کا رہے ہیں غضب خدا کا بیچاروں کے پاس بارہ بارہ ایک ایک بجے رات تک بیٹھتے ہیں وہ بیچارے بھی مارے مروت کے کچھ نہیں کہتے، اگر یہی لیل و نہار رہے تو شاہ صاحب کا یہ تقدس بھی کوئی دن کا مہمان ہے وہ بھی ایک نہ ایک دن رنگ پر آ ہی جائیں گے، میں پوچھتی ہوں کہ آخر آپ لوگوں کو ہو کیا گیا سب کے سب شریف پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور یہ حرکات، آپ ہیں کہ بلا کسی خوف کے جلسے اڑا رہے ہیں کل ہی کی بات ہے رمضان کی ۲۶ تاریخ کی رات کو جلسہ کیا اللہ اللہ کیسے دن اور آپ لوگ ہیں کہ جلسے مناتے ہیں گانے سنتے ہیں مجھ سے کہا کہ غیاث کے لڑکے کی بسم اللہ ہے دعوت میں جائیں گے صبح

نہایت غربت سے آکر سو رہے کہنے لگے رات ذرا جاگا تھا تھوڑی دیر قوالی ہوئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ قوالی نہیں اس شور اور والی کا گانا تھا۔ گن چال ایسے اور پھر دیکھئے تو "مولانا" وہ مضمون لکھیں گے کہ واہ جیسے کوئی بڑا ہی مقدس سید سلیمان یا عبدالباری فرنگی محلی بیٹھا لکھ رہا ہو دوسرے کی خانگی زندگی پر اعتراض کرینگے اوروں کے عیب گنتے پھرینگے مگر اپنے گریبان میں سر ڈال کر نہیں دیکھینگے ؎

کسی نے اونٹ سے پوچھا تیری گردن کیوں خم ہے
تو بولا کونسا عضو میرا شمشاد سے کم ہے

خدا کی مار اس گندم نما جو فروشی پر،
ظاہر میں آدمی تو بڑے شاندار ہیں

اسوقت بیگم صاحبہ کا پارہ اکیسو پندرہ سے بھی کچھ اونچا ہو چلا تھا۔ ہمیں خوف یہ تھا کہ کہیں حملہ آور نہ ہوں مگر خیر یہ گذری کہ ابھی وہ رجسٹر خوانی کر رہی تھیں کہ اذان کی آواز آنے لگی "الصلوۃ خیر من النوم" کو ہم نے دہرانے کے بجائے "الصلوۃ خیر من الغضب" کو تین تین چار چار دفعہ دہرانا شروع کیا اور دوڑ کر پھر غسل خانہ پہونچ گئے وضو کیا اور کمرے میں آکر جانماز بچھائی اور نماز شروع کر دی مگر بیگم صاحبہ اسی انداز سے بیٹھی رہیں ہمنے نماز کے بعد دعا مانگنی شروع کی کہ "خداوندا! بیوی کے غصے سے بچا"، پروردگار! گھر داماد ی کی لعنت سے نجات دیجیو" مالکا! ان ازدواجی زنجیروں سے چھڑائیو" خدایا

موت دیکھو کہ مرکر پیچھا چھوٹے ۔ یا گیارہ ہزار روپیہ دیکھو کہ مہر ادا کرکے اس بلا سے نجات پاؤں ابھی ہم نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ اثرِ اجابت ظاہر ہونے لگا بیگم صاحبہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور کہنے لگیں اجی مہر کیوں ادا کرتے ہو لو میں معاف کئے دیتی ہوں کہو تو لکھ دوں کہ میں نے مہر بخشا چلو اب تو خوش ہوئے نجات مل گئی مہر بچا اب رہی تمہاری بخشا ورسو میں نے اسے بھی آزاد کیا خوشی سے لیکو چلو چھٹی ہوئی ۔ دوستوں کے ساتھ مزے سے رہو اب جو ہمنے انہیں دیکھا تو اور ہی عالم تھا لیمپ کی روشنی بھیکی پڑ چکی تھی صبح کی سفیدی میں نظر آتی ساڑھی عجب بہار دے رہی تھی انکا مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا غضب ڈھارہا تھا ہم نے جا نماز سے اٹھکر بے تحاشا . پیا . . . . اور پھر نہایت ہی پھرتی سے انہیں کرسی پر سے اٹھا لیا کمرے میں پہونچکر چارپائی پر لیٹے ہی تھے کہ بیگم صاحبہ نے پھر شکوے شکایتوں کا دفتر کھولنا شروع کیا ۔ مگر دن بھر کی گردش رات بھر کی بیداری اور کوفت نے اس قدر تھکایا تھا کہ بادِ سحر کے دو ہی جھونکوں میں ہم فنا فی النوم ہوگئے شاید ہمیں سوتا پاکر وہ بھی سوگئیں دوسرے روز ہم بیدار ہوتے ہیں تو دن کے ڈیڑھ بجے ہائے کتنے مزے کی نیند تھی ہمنے اٹھکر انہیں بھی جگا دیا دونوں نے اٹھکر ضروریات سے فراغت حاصل کی ناشتہ کیا وہ جاکر اپنی بہنوں کے پاس بیٹھ رہیں اور ہم لگے انکشاف کیلئے مضمون لکھنے ہائے سہ

زندگی جور رد سے ڈر ڈر کے گزار نیکے تو پھر ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

مضمون کیسے لکھتے ہیں

"لکھنا، یا لکھنے کا ارادہ کرنا، یا لکھنے کے خیال سے قلم اٹھانا، یا کاغذ کھینچنا یا کوئی حرکتِ اضطراری یا غیر اضطراری ایسی کرنا جس سے "لکھنا" ظاہر ہو، جرم ہے ادھر ہم نے لکھنے کے خیال سے کرسی سیدھی کی اور ادھر بیگم صاحبہ نے سروتا اور چھالیا، یا کروشیا کی سوئیاں یا سوزن کاری کا چوکھٹا۔ یا لال برادرز، کا ناول یا اخبار صحیفہ جو کچھ ہاتھ میں تھا زور سے پٹک دیا اور گھورنے لگیں، ہم نے انگڑائی لیکر سگرٹ جلایا اور فلس کیپ کا تختہ کھینچا کہ وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں، ادھر ہم نے فونٹن پن اٹھایا اور ادھر وہ آگے بڑھنے لگیں ابھی ہم نے کاغذ پر ایک نقطہ بھی نہیں دیا تھا کہ انہوں نے "خطبۂ افتتاحیہ" یا "استقبالیہ" شروع فرما دیا، جس میں ہمارے دوست احباب، رسائل اور اخبارات اس کے مدیر اور ناشر، مرحوم والدین اور خسر صاحب قبلہ اور "ننھے" میاں طولعمرہٗ سب کے نام لیکے بعد دیگرے نہایت ہی سنجیدگی سے گنائے گئے اور وہ صلواتیں سنائی گئیں کہ ہم نے آنکھیں

بند کرلیں، قلم میز پر رکھ دیا، سگرٹ کو تھالی میں پھینکا اور پھر کرسی پر دراز ہو کر "شادی اور اُس کے مضر اثرات" پر ایک پُر مغز مقالہ ذہن میں ترتیب دینے لگے،

رات مولوی عبدالوہاب نے مرغ کی دعوت دی تھی۔ کھانیکے معاملہ میں ہم بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں، تیار ہو گئے مگر بیگم صاحبہ سے اجازت لینی بھول گئے۔ پانچ بجے مکتبہ پہونچے تو یاد آیا مگر کرتے کیا؟ مجبوری تھی کھانا کھا کر آٹھ بجے ریگل سینما پہونچے قلعہ دار کو ایک تصویر انلارج کرنے دی تھی خیال تھا کہ تصویر لیتے ہوئے گھر جائیں گے مگر دوکان بند تھی، مجبوراً آگے بڑھنا پڑا نانڈو کے کچھ پبلیس پر پہنچے تو نئی نئی تصویریں نظر آئیں اور ہم نے تعجب، حیرت، استعجاب سے دیکھنا شروع کیا اور رنگین پوسٹ کارڈ دیکھتے دیکھتے "کشمیر کی خوبصورتی" پر نظر پڑی تو طبیعت نکل گئی اسلئے نہیں کہ "حسن کشمیر" نے لبھالیا بلکہ چند "گذری ہوئی راتیں یاد آگئیں، ہائے عقل پر نہ جانے کیا پردے پڑ گئے تھے کہ ہم نے کچھ سوچا نہ سوچنے کی کوشش کی اور نہ اسوقت سوچ ہی سکتے تھے، سائکل سنبھالی اور کہیں سے کہیں پہنچ گئے مدتوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی کچھ "شکوے شکایتیں" ہوئیں، کچھ "رونا دھونا" ہوا، کچھ "باتیں واتیں" ہوئیں اب جو ہم گھڑی دیکھتے ہیں ساڑھے بارہ! اُف ہم تو سٹی بھول گئے مگر وہ بیچاری سمجھ دار تھیں کہنے لگیں "ہاں صاحب! بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہونگی جائیے جلد جائیے ایسی جلدی تھی تو آنا کیا ضرور تھا، برسوں کے بعد آئے بھی تو منٹوں کیلئے دیکھئے! کہیں

بیگم خفا نہ ہو جائیں۔ خدا حافظ تشریف لے جائیے" ہم لاکھ "زن مرید" سہی مگر ایک صنفِ نازک کے ایسے جلے کٹے فقرے کس طرح سنتے، جھٹ شیروانی اتار دی شوز اور پاتابے بھی نکال دیئے جیب سے دستی نکال کر گلے میں باندھ لی عینک بھی اتار کر رکھدی اور سگرٹ کیس لیکر دھم سے چارپائی پر آرہے، اس مجنونانہ حرکت سے اس نیک بخت کو خوشی ہوئی یا رنج پہنچا اسکا علم خداوند عالم ہی کو ہو تو ہو مگر ہم تو اپنی دانست میں زن مریدی کی تہمت سے بری ہو گئے رات گذری اور بے غل وغش گذری بقول حضرتِ جوش۔

صد عمر گراں مایہ سے بہتر ہے وہ رات　　　جو پہلوئے جاناں میں بسر ہوتی ہے

صبح ساڑھے چھ بجے چلے اور سونچتے چلے کہ کیا کریں آخر ایک ترکیب سوجھی ہم خوش خوش گھر پہنچے، پھاٹک پر رستم علی کو ڈانٹ بتائی دیوان خانہ میں لاور کو گالیاں دیں، سائیکل کو زور سے پٹک دیا اور زنانے میں داخل ہوئے بختاور راستہ کترا کر جانے لگی تو اسے بھی جھاڑ دیا اپنے کمرے میں پہنچکر دھماکے کیساتھ دروازہ کھولا دریچوں کو بھی زور سے کھینچ دیا۔ ٹوپی آرام کرسی پر پھینکی اور شیروانی تو ال اسٹانڈ پر ڈالدی، کالر کتابوں کی المارى پر پھینکا، پاتابے ردّی کی ٹوکری میں ڈالے عینک گھڑیال کے اوپر رکھی، ڈرار کو زور سے کھولکر سگرٹ کا ڈبہ نکالا، اور منہ ہی منہ میں چند بے معنی الفاظ کہتے ہوئے غسل خانہ کا رخ کیا۔ وہاں بھی خوب شور مچایا،

ہماری مسکینیت ضرب المثل تھی، ہم گرئیہ مسکین مشہور تھے گھر بھر کو معلوم تھا کہ ہمیں غصہ آتا ہی نہیں اور اگر کبھی آ بھی جائے تو بیگم صاحبہ کی معمولی سی ڈانٹ میں سب فو چکر، مگر آج ہمیں غصہ میں بھرا ہوا دیکھکر گھر کا گھر سناٹے میں آگیا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگا۔ ماموں صاحب چبوترے تک آکر دیوان خانے میں چلے گئے ہم نے انہیں سلام بھی نہیں کیا، ممانی صاحبہ کمرے کے سامنے اپنی منجھلی صاحبزادی کے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں اور لگیں چلمن سے جھانک جھانک کر دیکھنے ہماری منجھلی اور چھوٹی سالیاں بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئیں اور کانا پھوسی ہونے لگی، ہم نے کہا چلو ابتدا تو اچھی ہوئی خدا کرے انتہا بھی اچھی ہو،

ساڑھے سات بج گئے مگر ناشتے کا پتہ نہ دارد ہم نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نام بنام، بختاور، گلنار، لیلیٰ، ہارسنگار، انا جی آپا سب ہی کو ڈانٹ بتائی، آجتک ہم نے سوائے بختاور کے کسی کو کچھ نہیں کہا تھا یہ جو سب کے نام لیکر ہم نے اسپیچ دی تو بس سب کے سب دوڑ پڑے، کسی نے دسترخوان بچھا دیا کسی نے رکابیاں جمادی، کوئی کھانے کے برتن لانے گئی، کوئی دوڑ کر سیلانچی اور آفتابہ لے آئی، انا جی ہانپتے ہوئے آکر کھچڑی کا ڈش رکھ گئیں، گلنار نے پاپڑ کی رکابی رکھی، اور لیلیٰ نے اچار دان جمادیا، ہارسنگار مکھن لے آئی، آپا قیمہ کا کٹورہ لیکر دوڑی، ہم نے ناشتہ شروع کیا "ننھے میاں" کچھ رینگتے ہوئے آگئے۔ ہم نے بکمال شفقت پدری انہیں بازو بٹھالیا، اور ایک رکابی میں پاپڑ ڈال کر

سامنے رکھدیا وہ "ابا اماں روٹی" کھاتا ہوا پاپڑ کھانے لگا۔ ہم نے ناشتہ ختم کیا، چائے کی دو پیالیاں پیں اور باہر نکلنے کے قصد سے پاتابے اور شوز پہنے مگر صحن کو دیکھتے ہیں تو بھیگا ہوا، یوں تو کل چار بجے ہی سے بارش ہو رہی تھی اور صبح ہی سے تقاطر ہو رہا مگر اب تو اچھی خاصی پھوار تھی، ہم نے کہا جانے بھی دو، دوپہر کا کھانا کھا کر اطمینان سے چلینگے، بختاور نے کمرہ جھاڑ کر ٹھیک کر دیا تھا، ہم میز کے آگے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور لگے نیرنگ کیلئے مضمون لکھنے! حضرت عزیز نے مضمون کی فرمائش کی بھیجا تو لکھا کہ ایسا نہیں ایسا چاہئے، اب کہئے کیسا لکھیں؟ ہم نے بہتیرا سوچا مگر کوئی عنوان سمجھ میں نہیں آیا،

"وہ لائٹ ہیومر" چاہتے ہیں اور یہاں یہ حال کہ "دل ہی بجھ گیا" خوش مذاقی سوجھے تو کیسے اس کے لئے ضرورت ہے اطمینان، فارغ البالی، آسایش کی، خدا سلامت رکھے وہ بھیّا رمزی ہی ہیں کہ چاہے دو وقت کھانا نہ ملے مگر آپ "ظریفانہ" مضمون لکھے جاتے ہیں، ہم سے یہ نہیں ہوتا، خیر ہم نے کہا لاؤ کل کی دعوت کی تفصیل ہی لکھ دیں مگر اس میں کیا تھا بدمزہ سالن اور عبدالحق صاحب کے روکھے قہقہے! پھر خیال ہوا کہ گذشتہ رات ہی کے کچھ حالات لکھدیں مگر وہ بھی اس قابل نہ تھے، چند شکوے شکایتیں، کچھ جلے کٹے فقرے، آیندہ کیلئے وعدے اور قسمیں صبح کی دہشت انگیز واپسی! آخر سوجھی تو یہ کہ تفصیل ہی لکھدیں، ہم نے دعوت کے بعد سے ترتیب وار واقعات کو قلمبند کرنا شروع کیا اور فلسکیپ کے

ڈیڑھ صفحے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ کچھ "چلت پھرت" کے آثار معلوم ہونے لگے کمرے کے دروازہ کے پاس بڑی بیگم صاحبہ (ممانی اور خوشدامن) دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہوئی نظر آئیں، دونوں دریچوں کے پاس دونوں سالیاں چھپی ہوئی دیکھنے لگیں سامنے مدن مست کے درخت کی اوٹ میں گلنار اور لیلی کھڑی تھیں، غسل خانہ کے پردے کے پاس آیا، اناجی اور نجا ور کے سائے نظر آنے لگے ہم اس "نسوانی دھاوے" کا مطلب سمجھنے بھی نہیں پائے تھے کہ دبے پاؤں بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں، شہابی رنگت رونے سے سرخ ہو گئی تھی، آنکھیں اُبل آئی تھیں، گال تمتمائے ہوئے تھے، چہرہ پر ناشتہ نہ کرنے اور کسی قدر شب بیداری اور کرب واضطرار کی وجہ سے اُداسی برس رہی تھی، نہ تو لباس ہی بدلا گیا اور نہ منہ دھویا گیا تھا مگر باوجود اس کے ایک "خاص ادا" تھی جو مارے ڈالتی تھی، کچھ غصہ، کچھ خوف، کچھ نفرت، کچھ رحم، کے مختلف اثرات چہرے سے نمایاں تھے مگر پیشانی پر ہزاروں شکنیں، تیوری چڑھی ہوئی، ناک کے نتھنے پھولے ہوئے، ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے، ہم نے "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کیا اور لگے برداشتہ قلم لکھنے" وہ "آکر پیچھے کھڑی ہو گئیں ہم نے کاغذ پر بلاٹنگ پیپر رکھ دیا اور قلم کو ہونٹوں میں پکڑ کر غصہ سے دیکھنا شروع کیا، اُف! برس پڑیں اور بُری طرح برسیں!

"کہئے رات کہاں رہے؟ نہ جانے کس بیسوا کے یہاں رات گذاری صبح آئے بھی تو اس شان سے کہ سارا گھر سر پہ اٹھا لیا، اب حکومت شروع ہو گئی وہ

بھیگی بلی جو کل تک چوہوں سے ناک کترواتی تھی آج حملہ کرنے دوڑتی ہے خدا کی شان، تمہیں کو رات بھر بخار رہا، کھانسی کی وہ شدت تھی کہ غریب ساری رات نہیں سویا، مگر تمہیں کیا، تم کسی جگہ مزے اڑا رہے ہونگے، مہینہ میں دس بارہ راتیں ہی ایسی منحوس آتی ہونگی جو تم مکان پر سوتے ہو، ورنہ کبھی عبدالحق کے پاس دعوت ہوتی ہے تو کبھی عبدالوہاب کے پاس مہمانداری، کبھی عبدالرحمٰن سینما لیجاتے ہیں تو کبھی خانصاحب روک لیتے ہیں، کبھی رشید کو لمبو سے آتے ہیں تو کبھی رشید یادگیر کو جاتے ہیں، کبھی حمایت ساگر میں جلسہ ہوتا ہے تو کبھی گنڈی پیٹھ میں پارٹی ہوتی ہے، کبھی شمس آباد جاتے ہیں تو کبھی بھونگیر ہو آتے ہیں، یہ سب حیلے بہانے صرف رات بھر غائب ہونے کیلئے ہوتے ہیں، اور بس، ایسا ہی ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہدیتے کہ ہم آج رات گھر پر نہ سوئینگے، چلو چھٹی ہوئی، یہ جھوٹے واقعات بیان کرنے جھوٹ کہکر ایمان خراب کرنے سے فائدہ کیا؟

صبح ناشتہ کر کے غائب ہوئے تو ڈیڑھ دو بجے تک ندارد اور پھر آئے تو سوائے کھانا کھانے اور کپڑے بدل کر بھاگنے کے اور کوئی کام نہیں، کبھی اسمٰعیل صاحب سے ملنا رہتا ہے تو کبھی مجید سے، کبھی قلعدار کے پاس کام رہتا ہے تو کبھی تصدق حسین سے، کبھی مکتبہ جانا ہوتا ہے تو کبھی کتب خانہ ڈھائی تین بجے گئے تو پھر واپسی کی امید نہیں، وہ رات بڑی ہی خوش نصیب ہوتی ہے جو آپ کو آٹھ بجے گھر پہنچا دے ورنہ آپ تو دس گیارہ بجے آئینگے یا صبح کو، رات آئے بھی تو

کپڑے اتارے اور لگے ڈاک دیکھنے پھر جو خطوط اور مضامین لکھنے بیٹھ گئے تو دو دو بجے رات تک اور بعض وقت تو صبح تک اس مضمون نگاری کو خدا غارت کرے کہ اُس نے تم کو دین کا رکھا اور نہ دنیا کا، تمام وقت مضمون نگاری کی نذر سب کام اُس کے پیچھے خراب جورُو کی فکر نہ بچوں کا خیال، پانچ وقت کی نماز تو رہی دور آپ سے جمعہ بھی نہیں پڑھا جاتا، ساری دنیا جمعہ کی نماز کو جاتی ہے اور آپ بیٹھے مضمون لکھا کرتے ہیں۔ عیدیں گذر جاتی ہیں اتنا احسان تو کرتے ہیں کہ عید کی صبح اٹھکر نہا دھو لیا، اور پھر بیٹھ گئے لکھنے! جب سب لوگ نماز پڑھ کر عید گاہ سے آ گئے تو آپ لوگوں سے ملنے چلے، رمضان میں ایک بھی روزہ رکھا ہو تو روزی نہ ملے، شعبان میں قبرستان پر فاتحہ پڑھی ہو تو دشمنوں کو وہی زمین نصیب ہو، شبرات قدر، معراج میں نماز پڑھی ہو تو گنہگار، کبھی کسی چیز پر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ دیدی ہو تو دشمنوں کے ہاتھ ٹوٹیں، کبھی کسی کے وعظ میں گئے ہوں تو قسم لیجئے اور پھر آپ کے مذہبی جوش کا یہ حال کہ امان اللہ خاں کو افغانیوں نے تخت سے اتار دیا تو ایکدن کھانا نہیں کھایا، ہائے افغانستان اُجڑ گیا، ایک اسلامی سلطنت برباد ہو رہی ہے ایک اسلامی ملک متمدن بنتے بنتے جہالت کے گڑھے میں گر رہا ہے، کہکر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتے رہے، نادر خاں کی تخت نشینی کی اطلاع سے اتنے خوش ہوئے کہ میں نے جلوے کی رات بھی اتنی خوشی محسوس نہیں کی تھی۔ افغانستان بھاڑ میں جائے اور کابل کے تخت کو آگ لگے تم کون؟ تمہیں کیا کام؟ تمکو اس سے

غرض کیا ؟

بچہ بیمار ہے تو تمہیں فکر نہیں، میں مر اکروں تو تمہیں پروا نہیں، گھر میں چاہے کچھ ہو جائے تمہیں احساس نہیں، تمہیں فکر رہتی ہے تو افغانستان کی، ترکی کی، ایران کی، البانیہ کی، امان اللہ خاں، ثریا خانم، مصطفےٰ کمال، عصمت پاشا، رضا شاہ، احمد زوغو کی، آخر یہ لوگ تمہارے ہیں کون؟ خیر یہی غنیمت ہے کہ ممالک اسلامیہ اور اسکے فرمارواؤں سے تمہیں ہمدردی تو ہے مگر یہ مضمون نگاری آخر کیوں؟ معارف، نگار، ہمایون، نیرنگ خیال، مرقع، نیرنگ، تجلی، شاعر، فردوس، اولڈ بائے، ان رسالوں سے تمہیں کیا کام تم ندوۃ العلماء کے طالب علم نہیں، کسی مسجد کے مولوی یا خانقاہ کے پیرزادے نہیں پھر معارف سے دلچسپی کیوں، کوئی دہریئے لامذہب، پانچ کی بجائے دو نمازوں کے قائل نہیں، نیاز فتحپوری کے متبع نہیں پھر نگار سے ہمدردی کس لئے؟ لاہور سے کوئی تعلق نہیں، پنجاب میں پرورش نہیں پائی پھر ہمایون، نیرنگ خیال، فردوس کا کلمہ پڑھنا کیا ضرور، لکھنو کی شاعری سے تمہیں نفرت لکھنوی طرز معاشرت سے چڑھ، پھر مرقع سے لگاؤ کس لئے؟ رامپور تم نے دیکھا نہیں، پھر وہاں کے نیرنگ میں مضمون نگاری کیا معنی؟ امروہہ سے تمہیں کونسا تعلق، نام ہی نام تو سنا ہے پھر وہاں کے رسالہ شاعر کی فکر کس واسطے؟ حیدرآباد سے سینکڑوں رسالے نکل رہے ہیں بیسیوں اخبار جاری ہیں مگر تمہیں تجلی سے خصوصیت کیوں؟ سردار علی صاحب تمہارے اُستاد ہوں تو یہ کیا ضرور ہے کہ

سب رسالوں کو چھوڑ چھاڑ کر تم تجلّی ہی کے ہو رہو؟ آخر ان رسالوں کیلئے اپنی اوقات کب تک برباد کرو گے؟ نیرنگ خیال کا سالنامہ نکلے تو تمہیں فکر عید نمبر نکلنے والا ہو تو تمہیں خیال، نیرنگ کا خاص نمبر نکلے تو تم ہمہ تن متوجہ بھلا تم کون ساری جہاں کا درد تمہارے جگر میں کیوں؟ دس سال سے اپنی اوقات انہیں پرچوں کے پیچھے خراب کر رہے ہو، آخر کوئی فائدہ ہوا ہو تو بتاؤ اسوا اسکے کہ اور غلط فہمیاں بڑھ گئیں کچھ دنوں تو تو میں میں ہوتی رہی اس کلموہے محتسب نے احتساب لکھ مارا تم نے اس کا حلیہ لکھدیا، یوں چلتی رہی مضمون نگاری کیلئے روپیہ برباد، اوقات خراب، کام خراب اور پھر فائدہ ندارد، اورنگ آباد کے ایک نہیں دو چکر کاٹ کے کیا تو کیا کیا کہ ایک مضمون "اورنگ آباد اور اسکے نواح" کے عنوان سے لکھ مارا اور پندرہ روز اور روپیہ پیسہ خراب کر کے دولت آباد، خلد آباد، ایلورا کی خاک چھانی اور ہاتھ کیا آئے تو دو مضمون جن میں ایک مضمون پر اس لمبو ترے کلموہے نے احتساب بھی لکھ دیا، گلبرگہ کے قلعہ اور گنبد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، آٹھ سال وہاں رہکر ایک ایک چیز دیکھتے رہے، تاریخ بھی لکھی مگر وہ تو چھپوانی نصیب نہ ہوئی البتہ ایک مضمون لکھ مارا چلو بڑا کام کیا۔

رنگین، انشاء، قیس، جان صاحب کی ریختیوں کو سکندر نامہ کی طرح پڑھ پڑھ کر بازاری محاوروں کو سمجھنے کی خاطر ہندوستانی طوائفوں سے اختلاط پیدا کر کے دو تین مضمون ریختیوں پر لکھے تو کیا ہوا، کونسا خان بہادری کا خطاب

اور پنج ہزاری منصب مع پالکی جھالردار ملا؟ ادبیات اور تاریخ میں اس قدر سر کھپا کر اتنے مضمون لکھکر کیا فائدہ ہوا، افسانے لکھ لکھکر کونسے خطاب پائے؟ کسی چیز سے بھی کوئی فائدہ ہوا ہو تو بتاؤ سوا نقصان کے اور کچھ نہیں، لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ بیگم! تمہارے شوہر خدا رکھے حسین خوشرو، پڑھے لکھے، مضمون نگار، لائق اور مشہور اور نیک ہیں خدا ہر ایک لڑکی کو ایسا شوہر نصیب کرے، میں یہ سنتی ہوں اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں، خوش رو اور حسین شوہر کو لیکر کیا کروں جبکہ وہ مجھ سے دن بھر میں دو چار وقت بھی بات نہ کرتا ہو، پڑھے لکھے مضمون نگار اور لائق شوہر سے کیا فائدہ جبکہ مضمون نگاری سے اسے فرصت ہی نہ ملتی ہو اور وہ میری طرف متوجہ ہی نہ ہوتا ہو۔ ایسی شہرت کو آگ لگے جسکی خاطر انسان بیوی کو بھی بھول جائے، ایسی نیکی بھاڑ میں جائے جو سب کے لئے نیکی ہو اور گھر کی بیوی کیلئے بدی سے بدتر، کاش تم پڑھے لکھے ہوا مضمون نگار نہ ہوتے، مشہور نہ ہوتے، بالکل جاہل، لکھنے پڑھنے کے ناقابل نہایت ہی گمنام بہت ہی بدصورت، بڑے ہی بدمزاج ہوتے مگر مجھ سے سیدھی طرح رہتے جب تک گھر پر رہتے مجھ سے مخاطب رہتے واللہ مجھے دنیا ملجاتی دنیا!"

ہم نے لاکھ لاکھ ضبط کیا مگر طبیعت نکل ہی گئی خصوصاً آخری جملے پر آگ سی لگ گئی، ہم نے ڈانٹ کر کہا،

"ہم خوشرو ہوں، لکھے پڑے ہوں، مشہور ہوں، نیک ہوں اور تمہارے لئے

بد سے بدتر ہوں تو تم خوشی سے کسی جاہل، ناقابل، گمنام، بدصورت بدمزاج رات دن تم سے باتیں کرنے والے کو ڈھونڈ لو تمہیں دنیا مل جائے گی، ہم یونہی لنڈورے بھلے"

ہمنے کہنے کو تو غصے سے کہدیا مگر "وہ" بے تحاشا ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگیں، ہماری کرسی کے دستے پر سر رکھدیا، آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے کرسی کے دستے پر گر کر گدے پر گرنے لگے ہم چاہتے تھے کہ اسی حالت میں "انہیں" چھوڑ کر باہر چلدیں مگر قدم نہیں اٹھتا تھا لاکھ لاکھ چاہا کہ خاموش ہی بیٹھے رہیں مگر یہ بھی نہ ہو سکا، ریچرڈ ہنری سیوج نے سچ کہا ہے کہ "لوہا لوہے کو بیشک نرم کر سکتا ہے مگر مرد کا جوش عورت کے غصے کو ہرگز فرو نہیں کر سکتا" اور عورت کے معاملہ میں ایسا کون آدمی ہوگا جو قاعدے اور اصول کا پابند رہ سکا ہو، ہم اٹھ کھڑے ہوئے "انہیں" اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا، دلاسا دیا، تشفی دی، کچھ سمجھایا، ذرا گدگدایا، انتہا یہ کہ "مورا میکے میں جی گھبراوت ہے" گا کر ہنسا ہی دیا، ہنری مارٹین نے کس قدر ٹھیک کہا ہے کہ "مرد بالخصوص اس زمانے میں جبکہ اسکی بی بی کا عنفوان شباب ہوتا ہے اور اولاد بہت صغیر سن ہوتی ہے بہ نسبت "بہترین باپ" ہونیکے وہ بہترین شوہر قدرتی طور پر ثابت ہوتا،، پھر جلیت پھرت معلوم ہونے لگی، خوشدامن صاحبہ اپنے دالان کی طرف مسکراتی ہوئی تشریف لے گئیں دو نوکر مالیاں و ڈرتی ہوئی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں، چھوکریاں اور انا جی، آیا بھی رفوچکر ہو گئیں!

ہم نے "انکا" منہ دھلوایا گلنا ناشتہ لائی پھر ہم دونوں نے ملکر ناشتہ کیا "ننھا" بھی آگیا اور وہی ابا اماں روٹی کہکر باہر کھانے لگا، چائے پیتے ہوئے ہم نے ہنس کر کہا "منّے! اجازت دو تو ذرا مضمون ختم کرلیں نیرنگ کو بھیجنا ہے" تو ہنسکر کہنے لگیں، "ابھی تم کو اتنا کہا مگر کچھ اثر نہ ہوا، اچھا لکھ لو میں نہا کر کپڑے بدل لیتی ہوں"

ادھر وہ نہانے گئیں اور ادھر ہم نے مضمون لکھ لکھا کر ختم کرلیا۔

یہ ہے ایک گھریلو زندگی کا نقشہ، یہ ہے ہم مضمون نگاروں کی زندگی، یہ ہے ہم پڑھے لکھوں کی خرابی، یوں مضامین لکھتے ہیں اس طرح رات بھر غائب رہتے ہیں۔ یوں اثر ڈالنے کی فکر کرتے ہیں، اور پھر ایسے دبجاتے ہیں، کہئے پھر مضمون لکھا جائے تو کیونکر اور خوش مذاقی سوجھے تو کس طرح ہمنے جاں پر کھیل کر سارا قصہ لکھ تو دیا مگر خدا نہ کرے کہ یہ مضمون طبع ہو کر "بیگم صاحبہ" کی نظر سے گذرے ورنہ قیامت ہی آئے گی۔

ہم اور ہماری عید

عید کی خوشی ہر اُس شخص کو ہو سکتی ہے جو حقیقی معنوں میں روزہ دار ہو مگر ہمارے نزدیک عید کو روزوں سے اسی قدر تعلق ہوتا ہے جس قدر کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کو حقیقت و صداقت خلوص اور ہمدردی سے یعنی ان میں سے کوئی چیز بھی انکے پاس نہیں مگر وہ ہیں لیڈر اسی طرح ہم نے ایک روزہ بھی نہیں رکھا مگر عید منانے تیار ہو گئے۔

۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو ۹½ بجے رات کو ہم مکان پہنچے تو عجب چہل پہل تھی۔ بچوں کی چیخ پکار بڑوں کی ہنسی، بوڑھوں کی دوڑ سب ملکر ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہم نے کھانا کھا کر سونے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ہماری چھوٹی سالی صاحبہ آدھمکیں اور مجبور کر کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو مہندی لگا گئیں، بارہ بجے رات تک نداق دل لگی کر کے کہتی گئیں کہ اس عید کے تحفے میں ایک کروشیا کا سیٹ لونگی۔ ہماری بیگم صاحبہ اپنی والدہ کے پاس تھیں۔ نہ جانے کیا کیا انتظامات

ہو رہے تھے ہم نے ابھی خوابگاہ کا رُخ نہیں کیا تھا کرسی سے اٹھ کر انگڑائی ہی لے رہے تھے کہ "وہ" آ گئیں، کہنے لگیں "کہو تو سہی ہم کل کیا پہنیں"۔ ہم نے کہا خدا کیلئے کچھ نہ پہنو ایک عید یونہی بغیر پہنے اوڑھے سہی۔ کہنے لگیں "ہیں تم کو تو مذاق سوجھ رہا ہے"۔ ہماری شادی کے بعد سے کپڑے لتوں پر ہمیشہ لڑائی ہونے لگی اسکی وجہ یہ تھی کہ بعض رنگ جو ہماری بیگم صاحبہ کو پسند تھے ہمیں پسند نہ تھے اور بعض جو ہمیں پسند تھے انہیں ناپسند تھے، آخر میں یہ تصفیہ ہوا کہ ہم ان کے پسند کردہ کپڑے پہنا کریں اور وہ ہماری خواہش کے موافق لباس پہنیں۔ اسمیں شک نہیں کہ اس سے چند روز تک دونوں کو سخت کوفت ہوئی مگر رفتہ رفتہ عادت ہو گئی اب ہمیں وہ جو پہناتی ہیں ہم پہن لیتے ہیں اور ہم انہیں جو پہناتے ہیں وہ پہن لیتی ہیں۔ بعض خاص خاص موقعوں پر ایک دوسرے سے اجازت لیکر من مانے رنگ کے کپڑے بھی پہن لیتے ہیں۔ مگر ایسا اتفاق سال میں دو ہی تین بار ہوتا ہے۔ خیر

"انہوں" نے ہمارے لئے لیس، او، کا ایک پاجامہ، اودی دھاری دار سفید ریشمی شیروانی، زفر کی سرخ قمیص، باریک جالی دار نیم آستین نکالکر باہر رکھ دیا، دستی پاتابے اور جوتے ٹوپی کا انتخاب بکمال سرفرازی ہمیں پر چھوڑ دیا گیا، ہم نے "اُن" کے لئے نافرمانی رنگ کی ریشمی ساڑھی اور ہلکے آسمانی رنگ کا کرتا پسند کیا اور بقیہ کپڑوں کا انتخاب انہیں پر چھوڑ دیا، اس "کپڑوں کے انتخاب"

میں تین بج گئے، ہم نے چار بجے خوابگاہ کی صورت دیکھی، ٹھیک ساڑھے پانچ بجے بنجما ورنے دروازہ ٹھونک ٹھونک کر جگا دیا، ہم نے آواز سنی اور کروٹ بدل لی البتہ "وہ" اٹھ بیٹھیں انگڑائیاں لیں، لباس درست کیا اور پلنگ سے اتر کر کھڑی ہوگئیں لحاف کھینچ کر پھینک دیا اور لگیں ہمارے گال پر ستار کی مشق کرنے یعنی انگلی سے آہستہ آہستہ مارنے۔ ہم نے جب بھی آنکھیں نہیں کھولیں تو ناک کے دونو نتھنے پکڑ کر بند کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سانس رک گیا اور ہم نے بکمال اضطراب آنکھیں کھولدیں اور ہنسی خوشی اٹھ بیٹھے۔ ضروریات سے فارغ ہوئے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور کمرے میں آکر بیٹھ رہے۔ ننھے میاں طوعاً بھی اناّ کی گود سے اتر کر کرسیوں اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے آپہنچے اور لگے ہمارے گھٹنوں کے سہارے کھڑے ہو کر اول جلول بکنے اسی اثنا میں ناشتہ آگیا اور وہ بھی آگئیں اب ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ ناشتہ کر رہا ہے بچہ ہاتھ بڑھا کر کچھ مانگتا ہے تو باپ ایک آدھ نوالا منہ میں ٹھونس دیتا ہے مامتا کی ماری ماں مسکراتی ہے اور.........،

ناشتہ ختم کر کے ہم نے ٹھیک $\frac{1}{2}$ ۹ بجے قمیص پر عطر ملا دستی کے کونوں پر بھی لونڈر چھڑکا اور بن سنور کر چلے گھر سے پڑھنے کو نماز عید کی۔ مگر چار مینار تک آکر خیال آیا کہ اگر عیدگاہ جائیں تو راستہ میں بھیڑ بھاڑ زیادہ رہے گی واپسی میں بھی زحمت ہوگی، بہتر یہ ہے کہ کسی اور مسجد میں نماز پڑھ لیں پھر یاد آیا کہ

محلے کی مسجد میں نماز پڑھ لیں۔ پھر یہ بھی خیال ہوا کہ اب کہاں کی نماز کہدینگے کہ
عیدگاہ میں نماز پڑھ لی اب چلو لگے ہاتھوں چند لوگوں سے مل لیں، بس اس
آخری فیصلہ پر عمل کرنے کیلئے ہم نے سائکل موڑی اور سیدھے قطبی گوڑہ جا پہنچے
وہاں سے مل ملا کر نکلے تو دس بج چکے تھے راستہ میں جس قدر ملاقاتیوں اور
دوست احباب کے مکان ملے ہم نے سبھوں سے ملاقاتیں کیں آخر میں
عبدالحق کے پاس پہنچے عید کا روز تھا عبدالحق صاحب نے مکتبہ ابراہیمیہ کو
تعطیل دے رکھی تھی۔ وہاب بھی موجود تھے بہرحال دوپہر کا کھانا وہیں تناول
ہوا مغرب تک گپ ہوتی رہی مغرب کو چائے پی کر سینما پہنچے ۸½ بجے رات تک
سینما دیکھا اور تھیٹر سے نکل کر وہاب اور عبدالحق کو خدا حافظ کہتے ہوئے گھر کی
طرف چلے ابھی ہم افضل گنج کے پاس ہی پہنچے تھے کہ میاں غضنفر علی نے روک لیا
اور نہ صرف روکا بلکہ زبردستی ساتھ لیکر گھر کا رخ کیا ہمارا خیال تھا کہ مکان پر
دس پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس ہو جائیں گے مگر وہاں پہنچتے ہی تو "علی غول"
موجود "یارانِ نجد" کا مجمع، رات کا کھانا بھی وہیں ہوا اور پھر گانا شروع ہوا۔
"چمپا" واقعی اچھا گاتی ہے "جب تم چلو زمین چلے آسمان چلے" والی غزل
اس نفاست سے بتا کر گائی کہ واہ معلوم ہوتا تھا کہ واقعی زمین و آسمان دونوں
چل رہے ہیں۔ حضرت جلیل یقیناً موسیقی کے ماہر ہیں جبھی تو ایسی غزل کہی جو
بتا کر گانے کیلئے ہر طرح موزوں ہے خیر ۱۱ بجے سے صبح کے ۴ بجے تک گانا

ہوتا رہا اس اثنا میں گھر جانے کا خیال ہی نہیں آیا، صبح گھر چلنے کی فکر کی تو فدا حسین نے ناشتہ کر کے جانے پر مجبور کیا مجبوراً یہ بھی کرنا پڑا، ۹ بجے بدقت تمام غضنفر علی کے گھر سے چلے، میر عالم کی منڈی کے پاس میاں رشید مل گئے۔ معہ احباب سمیت، گنڈی پیٹ کے تالاب کو جا رہے تھے ہمیں جو دیکھا تو موٹر روک پکڑ ہی لیا کہ چلو، لاکھ لاکھ کہا کہ بھئی کل صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں جانے بھی دو، مگر کوں مانتا سائیکل اُن کے حوالے کر کے موٹر میں بیٹھنا پڑا اور چلے طرف گنڈی پیٹھ کے۔ راستہ میں یاروں نے ارادہ بدل کر حمایت ساگر چلنے کی ٹھان کی جوں توں کر کے تالاب پر پہنچے، دوڑنے کی مشق ہوئی، تیرنے کی شرطیں ہوئیں، گانے کا مقابلہ ہوا، تاش کھیلا گیا، بیت بازی ہوئی "صنم آمد" کا بھی شغل رہا، کھانا کھایا، چائے پی، مچھلیوں کا شکار ہوا، سات بجے شام کو ڈاک بنگلے میں آکر بیٹھ رہے ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ اب واپس ہونگے۔ پوچھا تو رشید نے بکمال متانت جواب دیا کہ "ابھی چلتے ہیں" مگر ۸ بجے ایک موٹر آیا جس میں ایک "منواں" کی (وہاں یہ لہجۂ خاص) بی صاحبہ تشریف فرما تھیں انکے سازندے اور سنگتی بھی ورلی طرف ہی کے تھے وہ سیدھی ڈاک بنگلہ پر ٹھہر گئیں۔ ایک صاحب نے بڑھ کر انہیں بلالیا اور اب وہ ہمارے سامنے گول میز کے پاس آرام کرسی پر گھبرائی ہوئی سی بیٹھی تھیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ "بی صاحبہ" چند ہی روز ہوئے آئی ہوئی ہیں رہنے والی یوپی کی ضرور ہیں مگر اپنے آپ کو خاص

لکھنؤ والی ظاہر کرتی ہیں اور میاں رشید کی بلائی ہوئی تشریف لائی ہیں بس ہمارا خون ہی خشک ہوگیا۔ خیال کیجئے، عید کی نماز کو گھر سے چلے تھے سارا دن گذر گیا رات گذر گئی دوسرا روز بھی آگیا اب دوسری رات کی باری تھی گھر پر ہنگامہ ہوگا خدا ہی بہتر جانتا ہے، واللہ خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوگئے حضرت ہم ٹھہرے "رسی ڈنٹ ممبر" یعنی گھر داماد، اب غور فرمائیے کہ ہم پر کیا کیا آفتیں نہ آئی ہونگی اور اسطرح غائب رہنے سے ہماری کیا گت بنے گی۔

ایک تجربہ کار، ستمہائے زوجہ و خوشدامن و خسر دیدہ، طمانچہ ہائے سالیاں چشیدہ "گھر داماد" کی حیثیت سے ہم تمام اپنے گھر داماد و خانہ داماد بھائیوں کو وصیت کرتے ہیں کہ بھائیو! اگر خیر چاہتے ہو تو ہر طرح جورو کے غلام بنے رہو، دوست احباب کو چھوڑ دو، گانے کے جلسوں کو سلام کرو تھئیٹر اور سینما دیکھنے کی قسم کھالو، دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر تک جایا آیا کرو اور بس، جورو جو کھلائے کھاؤ، اور خسر اور خوشدامن جو پہنائیں پہنو، جو حکم ملے "جنرل آرڈر" سمجھ کر تعمیل کرو ورنہ یاد رکھو اتنی بے بھاؤ کی پڑیگی کہ چاند پر ایک بال نظر نہ آئے گا..............

ڈاک بنگلے کے بیچ کے بڑے ہال میں دستر خوان بچھا سب نے ملکر تناول ماحضر سے عنداللہ ماجور" ہونے کی کوشش کی بلکہ بعض تو خوب مشکور ہوئے، اتفاق سے بی........جان ہمارے مقابل تشریف فرما تھیں دوران

تکلف میں کبھی ہم نے سالن کا کٹورہ انکی طرف بڑھا دیا اور کبھی انہوں نے بریانی کا ڈش ہماری طرف ڈھکیل دیا کبھی ہم نے بگھارے بینگن انکی پلیٹ میں جھونک دیئے، انہوں نے کھیر کی پیالی ہماری رکابی میں الٹ دی بہرحال اس تکلف نے بے تکلفی کی صورت اختیار کی کھانے سے فارغ ہونیکے بعد صرف ایک ہم ہی ہم تھے جو اُن سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آرہے تھے اُن کے پاندان کا پہلا پان ہمیں کو ملا اور وہ بھی اس شان سے کہ خود آں محترمہ نے اپنے دست نازک سے ہمارے ہونٹوں میں دے دیا جو بیگم صاحبہ کے خوف سے تھرا رہے تھے بلکہ قدرے زرد بھی تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم واقع ہوئے ہیں بہت ہی بے تکلف بلکہ بقول ..... کے "فاسٹ ورکر" ادھر آنکھ ملی اور اُدھر ہم نے سلام کیا ادھر سلام کیا ادھر مصافحہ ہوا کہ وہ ہنسے اور ہنسنا ہی تھا کہ ہم نے کچھ کان میں کہا ادھر سے انہوں نے بگڑ کر صلواتیں سنائیں اور ہم نے مسکراتے ہوئے کانا پھوسی کی تو بس کُھل گئے، الٹے ہاتھ سے ایک "مہین سا" طمانچہ رسید کر دیا، چلو ہم گال سہلاتے ہوئے بازو بیٹھ گئے پھر کیا ہے۔

ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

مگر یہ سب باہر ہوتا ہے گھر پر کچھ پیش نہیں جاتی۔ ہائے

ہمیں جورو کو اپنے دام میں لانا نہیں آتا بنانیوالے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

بہرحال، المختصر، ملاکلام، فی الحقیقت میں، امرِ واقعہ، یہ ہے کہ بی صاحبہ کی آنکھیں غضب تھیں گو،

وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

مگر آہوئے وحشی کم از کم مجھ مجنوں منش سے رام تھا، بس پھر کیا تھا گھر کی یاد یک قلم فراموش ہو گئی اتنا خیال ہے کہ گانا شروع ہوا

اتنا تو مجھے یاد ہے کہ کچھ گاتی تھی ......

کیا گاتی تھی .... مجھے کچھ یاد نہیں ہے

صبح گانا ختم ہوا تب کہیں مجھے ہوش آیا۔ انہوں نے کہا کہ چلو ذرا تالاب ہمیں دکھا دو ہم نے کہا زہے نصیب ساتھ لے کر چلے صبح کا وقت، سرد سرد ہوا چل رہی تھی رات بھر کی تھکن اور نیند کا خمار، ظالم کی مخمور آنکھوں کو اور بے پناہ بنا رہا تھا، نہ جانے میں نے کیا کہا اور انہوں نے کیا جواب دیا کہ میں نے ان مخمور آنکھوں کو چوم لیا، اگر چند لوگ ناشتے کیلئے نہ بلانے آتے اور ہمیں اس طرح "منسلک" دیکھ کر شور و غوغا نہ کرتے تو نہ جانے کیا کچھ ہوتا، خیر یہ گذری کہ ان حضرات نے ہمیں زبردستی ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا، ناشتہ ہوا، زرخوب ہوا، رشید نے واپسی کی تحریک کی اور کہا کہ ۱۱ بجے واپس ہونا چاہیے۔ مگر یہاں کون مردود اس قدر جلد واپس ہونا چاہتا تھا، میں نے کہا کہ دو بجے "قلعہ" جانا ہے میرے لئے "فون" کر کے ایک کار منگوا دو ڈیڑھ بجے میں قلعہ

جاؤں گا اور تم لوگ گھر چلے جاؤ رشید نے اسے منظور کر لیا اور چار کسی موٹر والے کیلئے "فون" کیا گیا، بی صاحبہ نے اس "قلعہ" جانے کی علت کو میری امیدوں کے خلاف بہت جلد بھانپ لیا کہنے لگیں "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی ساتھ چلوں مجھے بھی قلعہ دکھائیے" میں نے فوراً انکار کر دیا کہ مجھے فلاں صاحب سے ملنا ہے فلاں کے گھر جانا ہے مگر رشید وغیرہ نے مجبور کیا کہ "اماں! لے بھی جاؤ تم باہر بیٹھے جانا پردے لگا کر انہیں اندر بٹھا دو، تم جن سے بھی ملو گے آخر موٹر میں تو بلا کر انہیں ملو گے، جلد مل لینا یہ موٹر میں ٹھہری رہیں گی نہ جانے پھر اس طرف ان کا آنا ہو یا موقع نہ مل سکے یہ بھی قلعہ دیکھ لیں گی" مشہور ہے ہم نے بھی مفت کرم داشتن کے تحت منہ بنا کر رشید کے مشورے کو قبول کر لیا، ڈیڑھ بجے چلے، تھوڑی دور تک تو ہماری موٹریں ایک دوسری کے پیچھے پیچھے چلتی رہیں مگر پھر راستہ بدلنا پڑا ہم ایک طرف روانہ ہوئے اور رشید وغیرہ دوسری طرف قلعہ گئے کسی سے ملنا تھا ہی نہیں اور نہ ملنے کو جی چاہتا تھا وہ تو ایک بہانہ تھا ان حضرات کو رخصت کرنے کا قلعہ دکھایا اور پھر اسی ڈاک بنگلے کو لوٹ آئے جس میں ایک رات اور آدھا دن بسر ہو چکا تھا۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے ملکر تناول کیا اور سو رہے صبح سویرے ناشتہ کیا تالاب کی سیر کی اور ۹ بجے وہاں سے نکلکر ...... پہنچے یہ چشم پر ہم انہیں رخصت کیا دوسرے روز ملنے کا وعدہ کر کے چلے مگر مشکل یہ تھی کہ روپئے سب ختم

ہو چکے تھے۔ ...... کے پاس جاکر روپئے لئے ٹکسی کاکرایہ ادا کیا " کروشیاہ کا ایک سٹ چھوٹی سالی کیلئے لیا، بیگم صاحبہ کیلئے بھی دو تحفے لئے بچے کیلئے کھلونا خریدا اور تانگے میں لدے ہوئے گھر پہنچے "جل تو جلال تو" کا ورد کرتے ہوئے تانگے سے اُترے رستم علی نے آکر کھلونا وغیرہ آتارا ہم اندر پہنچے دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے کمرے میں "قل پنچ" ہے، خوش دامن صاحبہ سے لیکر مامائیں اور چھوکریاں تک یہیں جمع ہیں ہمارا "ننھا" بیچوں بیچ آنکھیں بند کئے پڑا ہوا ہے، سرہانے بیگم صاحبہ تشریف فرما ہیں، اس کے پائیں میں خوشدامن صاحبہ بیٹھی ہیں دونوں بازوں پر ہماری دونوں سالیاں ہیں، چھوکریاں بھی کھڑی ہوئی ہیں ہم نے کمرے میں داخل ہوکر خوشدامن صاحبہ کو سلام کیا اور بس مگر بڑی بی نے خلاف معمول نہ تو بلائیں لیں اور نہ دعا ہی دی صرف چھوکریوں اور ماماؤں نے ایک ایک بندگی کرکے فرار ہونا شروع کیا، سالیوں نے دیکھا تک نہیں البتہ دوپٹے کے پلّو سر پر کھینچ کر سیدھی ہو بیٹھیں "وہ" البتہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے آنکھ سے نکلکر رخساروں پر سے گرتے ہوئے ٹھوڑی کے پاس آکر "بہ اندازِ چکیدن سرنگوں" ہو گئے ہم نے نہایت سراسیمگی سے آگے بڑھکر ننھے کی نبض دیکھی معمولی بخار تھا تھرمامیٹر لگاکر ٹمپریچر لیا تو صرف ایک سو ایک ڈگری بخار تھا کمرے کا یہ حال تھا کہ ایک طرف انگیٹھی دہک رہی تھی دروازے بند اور ننھے کو دو موٹی موٹی

بلانکیٹ اڑھائی گئیں تھیں سب سے پہلے ہم نے انگیٹھی اٹھوادی، دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ ننھے کے پاؤں سے دونوں بلانکیٹ اُتار کر پھینک دیں اسٹانڈ پر سے توال لیکر ٹھنڈے پانی سے بھگویا اور اس کے سر پر ڈال دیا، چار پانچ منٹ کے بعد ننھے نے کروٹ بدلی اور پھر آنکھیں کھول کر ناتواں آواز میں پکارا "ابا" ہم نے گود میں اٹھالیا، پہلے تو اس نے پریشانی سے گھورنا شروع کیا اور پھر گلے سے لپٹ کر لگا رونے ہم نے سمجھایا کھلونے لانے کا تذکرہ کیا، بختاور کو بھیج کر رستم علی کے پاس سے کھلونے منگوائے، ریل، کبوتر، بندوق، ڈھول، بانسری دیکھ کر ننھا گود سے اتر پڑا۔ اور لگا ہنسنے پھر ذرا بندوق چلانے کی کوشش کی۔ کبوتر کو داب داب کر اُسکی آواز سُنی۔ اور ڈھول پیٹا، بانسری کو بھی دو ایک بار پھونکا، کنجی دیکر ریل کو اِدھر اُدھر دوڑایا ننھے کو اٹھکر کھیلتے دیکھکر بڑی بی کے ہونٹوں پر تبسم کی لہر دوڑ گئی اور وہ آہستہ سے اُٹھ کر چلی گئیں بیگم صاحبہ منہ ہی منہ میں بڑاتی ہوئیں کرسی پر جا بیٹھیں۔ دونوں سالیاں بھی ایک ایک کرکے کھسک گئیں، آپا البتہ ٹھہر گئی ننھا جب ریل سے اکتا گیا تو بندوق لیکر آپا پر پل پڑا مجھ سے کہنے لگا "ابا آپا کو ماروں" میں نے کہا بیٹا وہ مرجائے گی" کہنے لگا سلے ویسا نہیں ماروں گا" میں نے کہا زندہ رہی ویسا مارو" آپا نے آگے بڑھکر بلائیں لیں۔ اور بندوق سمیت گود میں اٹھاکر پیار کیا، ہم نے دودھ منگوا کر ننھے کو پلایا اس کے بعد وہ اطمینان سے کھیلنے لگا۔ پھر جو ٹمپریچر دیکھا تو نارمل تھا، بات

دراصل یہ ہوئی کہ دو دن ہمیں نہ دیکھ کر اس نے رُونا شروع کیا اور اسی رونے دھونے میں بخار آگیا، بجائے اسکے کہ اُسے بہلا پھسلا کر رُونے سے باز رکھا جاتا اور بخار کیلئے کوئی دوائی دیجاتی، عقلمندوں نے پلا دیا جلاب اور پھر کمرے کے دروازے بند کرکے انگیٹھی جلا کر دو دو بلانکٹ اڑھا کر اور ہوّا بنا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بخار اور بڑھ گیا۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچتے تو معلوم نہیں ننھے میاں رہتے یا اسی کمسنی میں" نوجوان والدین کو داغ مفارقت" دے جاتے۔

ننھے میاں کی آیا ہے بڑی سمجھدار۔ جب ہمیں بے چین دیکھی تو ننھے میاں کو مع کھلونوں کے گود میں لے اسکی خالہ کے کمرے کی طرف چلے گئی ہم نے بکمال اطمینان بیگم صاحبہ کا غصہ اتارنا چاہا، گدگدایا، چھیڑا، چٹکیاں لیں۔ منت و خوشامد کی دنیا بھر کی باتیں کیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں آخر ہم تھک کر بیٹھ گئے یہ ہماری طرف سے اعتراف شکست تھا، جب ہم نے ہار مان لی تو بیگم صاحبہ نے کرسی سے اٹھ کر ہماری طرف دیکھا آنکھیں سوجھی ہوئیں تھیں آنسوؤں کے قطرے کچھ آنکھوں کچھ گالوں اور کچھ تھوڑی پر بکھرے ہوئے تھے ہچکیاں لے لے کر انہوں نے عید کی رات سے ننھے کو بخار آنے اور اسکے بیہوش ہو جانے کا قصہ سنایا، اس کے گھڑی گھڑی ابا ابا کہہ کر چونک اٹھنے کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ اور نتیجہ میں ہماری بیوفائی، بچے سے نفرت گھر سے غائب اور دوستوں میں جلسے اڑانے پر خوب صلواتیں سنائیں، ہم نے

ایک ہی سانس میں بیس بائیس بہانے بنائے مگر انہیں پورے واقعات کا علم تھا۔ رشید میاں کے ملازم نے باوجود منع کرنے کے سائیکل گھر پر لا کر دے دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم رشید میاں کے ہمراہ گنڈی پیٹھ گئے ہیں وہاں جلسہ ہے رات کو گانا ہوگا، دوسرے روز میاں یحییٰ ملنے آئے تھے۔ رستم علی نے ان سے کہا۔ کہ میاں تو عید کی صبح سے غائب ہیں تو انہوں نے کہدیا کہ اجی عید کی رات کو تو غضنفر علی کے پاس جلسہ تھا، رات بھر وہ بھی ہمارے ساتھ چمپا کا گانا سنتے رہے صبح ناشتہ کرکے گھر کی طرف گئے تھے معلوم نہیں رستے سے کہاں غائب ہو گئے، عید کے دوسرے روز پاشا بھائی ملنے آئے تھے اُنسے ہماری بیگم صاحبہ نے ہمارے غائب ہونیکا قصہ فرمایا تو انہوں نے کہدیا کہ میں نے عید کے روز اسلسی آر کے فسٹ شو میں انہیں دیکھا تھا، بیگم صاحبہ کو یہ ساری باتیں معلوم ہوئیں تو انہوں نے کڑیاں ملا کر عید کی دوپہر عبدالحق کے ہاں بسر کرنا، شام سے سینما دیکھنا، رات کو چمپا کا گانا سننا دوسرے روز صبح وہاں سے چلنا راستہ میں سائیکل ملازم کو دے کر موٹر میں گنڈی پیٹھ جانا سب معلوم کر لیا، تیسرے روز رشید کے گھر پر آدمی بھیجکر دریافت کرایا تو پتہ چلا کہ ہم قلعہ دیکھنے چلے گئے تھے۔ رشید واپس ہو گئے ہیں۔ رستم علی سے کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہمنے موٹر میں ایک بی صاحبہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا، یہ اطلاع بھی پہنچ گئی۔ بہرحال ہماری پوری کارستانیاں سوا آخری رات کے واقعات کے

معلوم ہو چکیں تھیں۔ اور آخری رات کے متعلق بیگم صاحبہ کو یہ یقین تھا کہ ہمنے اسی کے ساتھ قلعہ میں بسر کی جو ہمارے ہمراہ موٹر میں گئی تھی۔ ہمارے جھوٹ بولنے کی کوشش بیکار ہوئی ایک ایک کرکے سب انہوں نے سنا دیئے، اب ہمارے لئے صرف ایک راستہ تھا۔ وہ یہ کہ معافی مانگ لیں اور آئندہ کیلئے وعدہ کرلیں، ہم نے مجبوراً بادل ناخواستہ یہ بھی کیا، انہیں کی قسم کھائی کہ آئندہ کسی عورت سے نہ ملیں گے۔ اور بلا اجازت کسی جلسے میں نہیں جائینگے ایک گھنٹہ کی منت وخوشامد کے بعد کہیں ان کے آنسو تھمے۔ اور انہوں نے "عید کی ملاقات" کی تین بجے کھانا نصیب ہوا کھانا کھا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ اپنی والدہ بہنوں سے لے کر ماماؤں چھوکریوں تک سے ہماری اس منت وخوشامد اور قول وقسم کا تذکرہ کر دیا، دونوں نیک بخت سالیاں تو مدت سے ہم پر جلی ہوئی تھیں۔ انہیں موقع ہی ملا، ایک کو کروشیا کا سٹ اور دوسری کو "پھندے" دے کر سمجھانا چاہا۔ مگر باوجود دونوں نے دونوں چیزوں پر قبضہ کرنے کے ہمارا شکریہ تک ادا نہیں کیا بلکہ بنائے گئیں ساڑھے پانچ بجے بڑی بی ٹہلتی ہوئی کمرے میں آئیں ہم نے جھک سلام کیا بلائیں لیں، دعائیں دیں، دالان میں سلامی کی کشتی رکھکر آئی تھیں وہ منگوا دی اور جاتے جاتے "آج تو آپ کو گانے والے کی دعوت نہیں ہے" پوچھ کر ایک چرکا دیتی ہوئی تشریف لے گئیں۔ مگر ان کے آنے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہماری

دونوں نیک بخت سالیاں چپکے سے کھسک گئیں۔ بڑی بی نے خود جاکر بیگم صاحبہ کو بھیج دیا۔ ہم دونوں نے ساڑھے آٹھ بجے رات تک ترکی گنجفے سے دل بہلایا۔ پھر کھانا کھا کر سو رہے۔

یہ حال ہے ہم بدنصیبوں کا اور یوں ہوتی ہے "خانہ داماد ونکی عید" خیر!

"بر سرِ دامادِ آدم ہر چہ آید بگذرد"

ہم مضمون کیوں نہیں لکھتے

ہمارے لئے سب سے آسان کام دو ہیں۔ ایک تو مضمون لکھنا اور دوسرے گلی کوچوں میں پھرنا۔ مگر بدنصیبی دیکھئے کہ یہ دونوں کام ہم کر نہیں سکتے۔ ادھر ہم نے کھنکارتے ہوئے سگرٹ جلایا اور کرسی کھینچ کر میز کے سامنے بیٹھنے کا ارادہ کیا اُدھر وہ" ہوشیار ہو گئیں۔ پہلے تو کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھا، کچھ مسکرائیں اور پھر ایک خاص انداز سے انگڑائی لے کر ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔ اگر ہم نے نہایت شرافت سے کرسی پر بیٹھکر میز کو انگلیوں سے ٹھوکنا شروع کیا اور تال سُر سے ٹھیک ہو کر۔

جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

گانا شروع کر دیا تو انہوں نے نہایت متانت سے مسکراتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ ورنہ ہم میز پر سے کاغذ لیکر قلم اٹھانا چاہیں تو بس غضب ہو گیا۔ ناک بھوں چڑھا کر گھورنا شروع کیا، سانس پھول گیا، چہرے پہ سرخی دوڑ گئی

ہونٹ کانپنے لگے اور انہوں نے تن کر دیکھنا شروع کیا۔ اس پر بھی اگر ہمنے فونٹن پن سنبھال کر لکھنا ہی شروع کر دیا تو بس وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔ نہایت تیزی سے اٹھکر ہمارے برابر آ گئیں اور کھڑی ہو کر لگیں سروجنی نائیڈو کی طرح نہایت فصاحت اور بلاغت سے خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے۔ مگر یہ خطبہ لیڈیز اینڈ جنٹلمین سے نہیں بلکہ "خبردار پھر تم نے لکھنا شروع کیا" سے شروع ہوتا ہے۔ اگر اسوقت بھی ہم نے بکمال سعادتمندی کاغذ رکھ دیا اور قلم پھینک کر انکی طرف توجہ کی اور دونوں ہاتھ مقام کر

تجھکو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں

گانا شروع کیا تو پھر اُن کا غصہ بھی غائب، ورنہ خطبۂ صدارت بکمال زور و شور جاری رہا۔ اس میں نہ تو کھدر پوشی پر زور دیا جاتا ہے اور نہ نمکخوری یا قانون شکنی پر، بلکہ اپنے احسانات محبت، وفاداریاں اور خدمات گنائی جاتی ہیں اور پھر ہماری احسان فراموشی، بے التفاتی، غیر وفاداری، عدم توجہی، اور بے خبری وغیرہ عنوانات پر ایک بسیط نظر ڈالی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں آئے ہوئے خیالات سب فوچکر ہو جاتے ہیں اور ہم نہایت ہی سادہ لوح بنکر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کس طرح اس بلا سے نجات حاصل کیجائے۔ جب تک ہم کاغذ اور قلم پھینک کر معافی نہ مانگ لیں وہ نہیں مانتیں۔

کہئے اب ایسی حالت میں ہم کیا لکھیں؟ بھیّا شاہد احمد مدیر رسالہ "ساقی" سے مدت ہوئی ہم نے وعدہ کیا تھا کہ "ساقی" کیلئے خوش مذاقی (لائٹ ہیومر) لکھنا ہمارے ذمے مگر یہاں لکھنے کی اجازت بھی تو ملے۔ ہمنے انہیں سمجھایا کہ دیکھو بھیّا شاہد ہمارے دوست ہیں جس زمانے میں مولوی بشیرالدین احمد مرحوم رائچور کے اول تعلقدار تھے اسی زمانے ہمارے والد مرحوم وہیں پر صدر خزانہ دار تھے۔ ہم دونوں کا بچپن ایک ہی جگہ گذرا۔ ہمارا فرض ہے کہ شاہد بھیّا کے رسالے کیلئے لکھتے رہیں مگر انہوں نے سب سنکر کہا تو یہی کہ کیا دنیا میں ایک آپ ہی مضمون نگار رہ گئے ہیں۔ آپ نہ لکھیں تو ساقی میں کوئی بھی نہیں لکھیگا؟ کہئے اب ہم کیا جواب دیتے؟

شاہد صاحب الگ بگڑے بیٹھے ہیں کہ ہم "ساقی" کیلئے کچھ نہیں لکھتے اور اُن کے بھائی مبشّر جدا خفا ہیں کہ باوجود مجبور کرنے کے مضمون نہیں بھیجتے شاہد صاحب کو ایسی مجبوری نہیں۔ ماشاءاللہ سے بھابی صاحبہ خود تعلیم یافتہ اور اچھی مذاق رکھتی ہیں "ساقی" یقیناً انکی اجازت سے جاری ہوا ہوگا! مبشّر صاحب تو بلاؤں میں پھنسے ہی نہیں کہ "زن مریدی" کیا چیز ہے؟ اسی لئے دونوں حضرات ہیں پر الزام دھرتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ

ہماری بیوی ہم کو بات تک کرنے نہیں دیتی

اسکی وجہ یہ نہیں کہ وہ جاہل ہیں اجی حضرت وہ خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ فارسی۔ اردو

اور تھوڑی انگریزی بھی پڑھ لیتی ہیں۔ فارسی میں مجلّہ ارمغان (طہران) کا مطالعہ فرماتی ہیں۔ دیوان حافظ کا اکثر مطالعہ فرمانے کے علاوہ فال بھی دیکھ لیتی ہیں۔ ایران کی اور مطبوعات بھی کبھی کبھار پڑھ لیتی ہیں اکثر فارسی کے شعر یاد ہیں۔ کبھی ہم نماز پڑھتے ہیں تو گنگنانے لگتی ہیں ؎

چوں زمیں بسجدہ کردم ززمیں ندا بر آمد
کہ مرا خراب کردی تو ز سجدۂ ریائی

خیام نیشاپوری کی اکثر رباعیات برزبان ہیں۔

تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

تو بس ورد فرماتی رہتی ہیں اور

ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

تو بس تکیہ کلام ہے۔ اسی طرح عربی کے جملوں کے جملے اور ٹکڑوں کے ٹکڑے ازبر ہیں بھلا ایک دو ہوں تو گناؤں۔ مختصر یہ کہ بیوی صاحبہ عربی دانی میں ابوالکلام کی ثانی ہیں تو فارسی دانی میں آقا داعی الاسلام کی ہم پلہ ہیں اردو تو ماشاء اللہ مادری زبان ہی ہے لب و لہجہ ایسا عمدہ کہ

"آپ سنئے تو پھڑک جائیے گا"

بالکل پنجابی لہجہ "نے" کا استعمال غلط نہیں کرتیں مگر سخت لہجہ ضرور اختیار کر لیتی ہیں یہ صرف ہم سے گفتگو کرتے ہوئے ورنہ کسی اور سے بات چیت ہو گی تو وہ

"منواں" کا لہجہ اختیار کرلیں گی۔ اور "ارے سے، ورے سے، ہنیاں اور ہنواں سے سے لیکر" کیچ" تک بولیں گی۔ اردو کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ شرر کے ناول اور داستان امیر حمزہ کی ساتوں جلدیں اور پھر طلسم فتنۂ نور افشاں، طلسم حیرت بالا باختر کوچک باختر ایرج نامہ۔ تورج نامہ اور نوشیروان نامہ سبھی چاٹ گئی ہیں سرشار کی تالیفات کا ملاحظہ بھی ہو چکا ہے حکیم محمد علی سے لیکر لکشمن دت عابر اور کمند آگوہر کے ناول تک پڑھ ڈالے ہیں۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے اب بھی پڑھتی ہیں ظفر عمر کا ناول "لال کٹھور" طبع ہوا تو منگوایا مگر آدھے تک نہ پہنچی تھیں کہ پھینک دیا فرمانے لگیں "نیلی چھتری" اور "بہرام کی گرفتاری" کے لکھنے بعد "لال کٹھور" جیسا ناول لکھکر ظفر عمر نے اپنی ادبی اسپرٹ کے تباہ یا مفقود ہو جانے کا اعلان کر دیا اب تو انکی اردو بھی لنگڑاتی ہے"۔ کہئے ایسی بے پناہ تنقید نگار کو کیا آپ جاہل سمجھیں گے؟

"وہ" اخبار صحیفہ، اخبار مشیر دکن اور اخبار رہبر دکن سبھی دیکھتی ہیں۔ صحیفہ کی مقامی میں ایک مبتلا و فوت اور چار مسافر وار دیا سمت افضل گنج میں ایک سائیکل سوار نے ٹکر دی تھی بر سر موقع گرفتار کر لیا گیا اور بوندا باندی، ابر آرائی" وغیرہ دیکھ کر بہت خفا ہوتی ہیں انہیں تو ایسے جملے اور فقرے جو صحیفہ میں لکھے گئے ہیں، زبانی یاد ہیں۔ مشیر دکن کے لیڈنگ آرٹیکل سے تو انہیں نفرت ہے سارا اخبار پڑھ لیں گی مگر لیڈنگ آرٹیکل دیکھنا تک پسند نہیں کرتیں اخبار رہبر دکن

کے بعض مخصوص مقالے وہ غور سے پڑھتی ہیں۔ مگر بعض تراجم کو ایک نوٹ بک میں درج کرنے کیلئے مجھے کہا کرتی تھیں "چو قومہ یا چو قومی" اور "وقت نامہ" وغیرہ الفاظ جو انگریزی الفاظ کے ترجمے ہیں انہیں یاد کرکے ہنستی ہیں یہی یہی یہ دلچسپ بدحواسیاں، چاہے وہ صحیفہ کی ہوں یا مشیر کی یا رہبر کی۔

یہ تھی انکی ناولی اور اخباری مصروفیت۔ اب ذرا رسالوی مصروفیت کو ملاحظہ فرمائیے۔ "معارف" سے لیکر بلند شہر کے رسالہ "رفیق" تک کو اور "نور جہاں" سے لیکر "عصمت" تک کو ہر مہینہ بلاناغہ ملاحظہ فرماتی ہیں۔ آرٹ سے اس قدر ذوق ہے کہ "چاند" "نیرنگ خیال" "عالمگیر" وغیرہ کی رنگین اور عمدہ تصویروں کو رسالہ آتے ہی نکال کر فریم کراکر دیوار پر لٹکادیتی ہیں بعض انگریزی اخبارات کے "اینول" محض تصاویر کیلئے منگواتی ہیں۔ انگریزی صرف اس قدر جانتی ہیں کہ لفافے کا پتہ پڑھ لیتی اور تصویر کے نیچے کا نام سمجھ لیتی ہیں۔

کہئے اب تو آپ تعلیم یافتہ سمجھ لیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ حساب بھی لکھ لیتی ہیں۔ دھوبی کو کپڑے لکھ کر دیتی ہیں اور ہمیشہ دو تین کپڑے زیادہ لکھدیتی ہیں یا کم مگر لکھتی ضرور ہیں خط بھی خراب نہیں لمبے لمبے حروف بالکل ایسے ہی لکھتی ہیں جیسے کہ بہزاد ہند مسٹر چغتائی لکھا کرتے ہیں۔ شاعری سے بھی بہت لگاؤ ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتی ہیں مگر سنانے سے نفرت ہے اساتذہ کے دواوین برزبان ہیں۔ خاکی اور دلی سے لیکر اقبال اور رفانی تک کا کلام سن لیجئے اکبر کے تو

سیناکڑوں شعر یاد ہیں۔ خاصی انشا پرداز بھی واقع ہوئی ہیں مدت ہوئی آپ نے ایک کتاب بھوپال سے منگوائی تھی جس کے دو حصے تھے مگر وی پی کھولا گیا تو ایک ہی حصہ نکلا قیمت دونوں حصوں کی وصول کرلیگئی تھی اس بے ایمانی پر جو غصہ آیا تو آپ نے دو نوٹ پیپر سیاہ کردیئے اس کا ماحصل یہ تھا کہ آپ نے دونوں حصوںکی قیمت کا وی پی کیا مگر پارسل میں ایک ہی حصہ رکھدیا۔ اس بے ایمانی سے نہ آپ امیر ہو جائیں گے نہ ہم غریب" مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ ہم ان کے پلے نہیں باندھے گئے تھے شادی ہونے سے پہلے کا مگر اب تو خاصی ادیبہ ہو گئیں ہیں۔

حافظہ اتنا اچھا ہے کہ اپنی تسمیہ خوانی سے لیکر ابتک کے پورے واقعات (بلا تعین تاریخ و سنہ) یاد ہیں۔ ہم اگر کچھ کہدیں تو کنقش الحجر ہو جاتا ہے مگر وہ لڑائی جھگڑے کی بات ہو تو ورنہ کوئی کام یا فرمایش یاد ہی نہیں رہتی اگر ہم دفتر کو جاتے ہوئے کہتے ہوئے جائیں کہ دیکھو ہمیں شام کو دعوت میں جانا ہے۔ کوئی سفید شیروانی نکال کر گنڈیاں لگا دینا اور کسی رنگین قمیص کے بٹن بھی دیکھ لینا اور ایک دستی (رومال) بھی نکال دینا۔ تو وہ نہایت ہی متانت سے اچھا ضرور کہدینگی مگر ہم دفتر سے آکر چائے پینے کے بعد جب شیروانی اور قمیص مانگیں گے تب کہیں اٹھکر جیسٹ ڈرا کھولیں گی۔ اور اگر پوچھ لیا کہ دوپہر میں کیوں نہیں نکالا تو معصوم صورت بنا کر کہدیں گی کہ "بھول گئی تھی" اسی طرح ہمارا ہر کام

بھلا دیا جاتا ہے۔

لاحول ولا ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہاں تو حضرت بات دراصل یہ ہے کہ

لطیف بود و حکایت دراز تر گفتم

خانگی معاملات اور گھریلو زندگی کے واقعات پبلک نہ ہونے چاہئیں مگر کیا کیا جائے "یہ ٹانگ کھولوں تو لاجوں مروں وہ ٹانگ کھولوں تو لاجوں" لکھوں تو بدنام ہوں، انکی باتیں سنوں، غصہ سہوں سب کچھ کروں اور نہ لکھوں تو شاہد بھیّا کی نظروں میں بددماغ۔ خشک مزاج وعدہ فراموش اور متکبّر ٹھیروں۔ عجیب مصیبت ہے۔ دفتر میں لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ گھر پر وہ لکھنے نہیں دیتیں۔ مکتبہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور گذرتا ہے۔ وہاں لکھنے کا ارادہ کرنا مشکل۔ ادہر ہم نے کچھ لکھنا چاہا ادہر عبد الحق صاحب نے چار چھ کتابیں منگوا کر سامنے رکھدیا ایک پان کا بڑا بازار کا منگوایا ہوا (کیونکہ انکی محترمہ بھی انہیں پان نہیں بھیجتیں) سرکا دیا اور گال پھلا کر فرمانے لگے۔ تمکین! ذرا ان کتابوں کے اشتہار تو لکھدو! چلو چھٹی ہوئی۔ اشتہار لکھتے لکھتے مغرب کا وقت ہوگیا۔ ہم نے سائکل سنبھالی اور گھر کا راستہ لیا۔ اگر مولوی عبدالوہاب پہنچ گئے تو کاغذ کھینچ کر پھینک دیا اور سخت نامعقول ہو کہکر ایک دو گھونسے رسید کر دیئے۔ یا کرسی لڑھکا دی اور لکھنا ختم۔ اگر وہاب نہ آئیں اور عبد الحق اپنے لین دین میں مصروف ہوں تو میاں حامد نے اپنے خاص اور زنگ آبادی

لہجہ میں حاجیوں کو لیکر جدہ جانے والے جہاز کا قصہ بنگالیوں اور بنجاریوں کو گالیاں سناتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ پھر کلکتہ کے قیام کے زمانہ کے تجربات عالیات سے معلومات میں اضافہ فرمانے لگے۔ چلو لکھنا ہوگیا۔ کہئے اب کیا کیا جائے۔

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا ست

وہاب کی مقشر ڈاڑھی کی قسم ہے کہ ہم چار مہینے سے "ساقی" کیلئے ا ائٹ ہیومر لکھنے کے خیال میں رہتے ہیں مگر لکھنا نہیں ہوتا۔ آخر سوچتے سوچتے ہم نے لکھ ہی لیا، آپ پوچھیں گے کس طرح سنئے!

آج کل صبح کے دفاتر ہیں۔ ہم ٹھیک پانچ بجے جاگتے ہیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کر کے ٹھیک ساڑھے چھ بجے دفتر چلے جاتے ہیں اور پھر ٹھیک ایک بجے دفتر سے گھر آجاتے ہیں۔ "وہ" بھی ہمارے ساتھ جاگتی ہیں اور ہمارے دفتر سے گھر آنے تک کام کاج میں مصروف رہتی ہیں ڈیڑھ بجے کھانا کھا کر دو بجے ہم سو جاتے ہیں اور وہ بھی فنا فی النوم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر پانچ بجے جاگتی ہیں ہم بھی روزانہ دن میں پانچ بجے تک سویا کرتے تھے آج اتفاق سے "وہ" سو گئیں مگر ہمیں نیند ہی نہیں آئی ہم نے کہا چلو "ساقی" کے لئے ہی کچھ لکھ لیں اور بیٹھ گئے کاغذ لیکر۔ اسوقت ساڑھے چار بجے ہیں۔ ٹھیک پانچ یا اس سے کچھ پہلے وہ جاگیں گی۔ اس لئے ہم ابھی سے

مضموں ختم کر دیتے ہیں ورنہ انہوں نے دیکھ لیا تو آفت آجائے گی۔

پانچ بجے وہ جاگ کر منہ ہاتھ دھو کر پوچھیں گی تو کہدیں گے کہ تم سے دس منٹ پیشتر جاگا ہوں۔ چلو چھٹی ہوئی، ادہر بھیّا شاہد کی خفگی سے ادہر اُن کے غصہ سے۔

یہ ہے ہمارے مضمون نہ لکھنے کی وجہ ورنہ ہم اور مضموں نہ لکھیں، ناممکن، بھیّا شاہد کو اب تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کس قدر مجبور ہیں اگر ممکن ہوا تو ہم کبھی نہ کبھی اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ تصویر بھی "ساقی" میں شایع ہونے کیلئے روانہ کر دیں گے جو آئے دن گھر میں ہر ایک کو نظر آتی ہے۔ جب کبھی وہ خفا ہو کر ملتی ہیں ہم اور وہ ملکر بیٹھ جاتے ہیں ننہا آکر گود میں سوار ہو جاتا ہے اور وہ ......"

——— پھر تو یہ منظر رہتا ہے کہ

فوق البشر نشستہ ہے اک شوہرِ غریب مصروفِ غور کف میں زنخداں لئے ہوئے
پہلو میں اسکے اک زنِ گلگوں گداز تن آبِ حیات سینۂ عریاں لئے ہوئے
مصروفِ نوش چشمۂ آبِ بقا پہ ہے
ننہا دہن میں غنچۂ پستاں لئے ہوئے

جھوٹ

اگر مجھ سے پوچھئے تو میں "جھوٹ" کو فنونِ لطیفہ میں جگہ دوں گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بعض وقت انسان کو بچا لیتی ہے۔ بلکہ محض اسلئے کہ اس کے کہنے اور اسکو نباہنے کے لئے بھی خاص دماغ داری اور فطری نفاست کی ضرورت ہے، میں ایسے جھوٹ ہی نہیں سمجھتا جو بنہ نہ سکے، جو ظاہر ہو جائے اور جسے کوئی یقین نہ کرے جھوٹ وہ ہے جو نہایت ہی ثقاہت، سنجیدگی اور اطمینان کے ساتھ بلا سوچے سمجھے کہی جائے اور سننے والا اسکو کم از کم واقعہ تصور کرے کہنے والے کیطرف سے بدگمان ہو نہ بدگمانی کا اندیشہ ہو۔

"جھوٹ" کہنے کی مشق کرنی حماقت ہے، فنون لطیفہ کی طرح دروغ گوئی کسب سے نہیں آسکتی۔ "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" یہ بالکل فطرتی اور قدرتی چیز ہے، ہر بچہ ایک تیزی ایک ذہانت ایک چلبلاپن ایک معاملہ فہمی ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے، والدین اور عزیز و اقارب دوست احباب ملنے

بے جلنے والوں کی صحبت میں ان چیزوں پر جلا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ہر ایک چیز معراج کمال پر پہونچنے لگتی ہے، بد مذاق والدین بچے سے بے تکی جھوٹ یا دھوکہ آمیز گفتگو کر کے اسے جھوٹا بنا دیتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں ہزاروں جھوٹے ملیں گے سینکڑوں جھوٹ آپ خود سن چکے ہونگے اور سینکڑوں دفعہ آپ نے خود جھوٹ کہی ہوگی۔ مگر آپ نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا کہ یہ ہے کیا چیز؟

یہ ایک تحفہ ہے جو والدین اپنے عزیز لڑکوں کو دیتے ہیں یہ ایک انعام ہے جو استاد اپنے شاگرد کو دیتا ہے یہ ایک تمغہ ہے جو دوستوں کی طرف سے دیا جاتا ہے یہ ایک امانت ہے جو بیوی سپرد کر دیتی ہے۔

بچہ عموماً ماں کی گود میں جھوٹ بولنا سیکھتا ہے۔ مجھ سے گو میری والدہ نے کبھی کوئی بات جھوٹی نہیں کہی مگر کہلائی اور انّا کی جھوٹ نے مجھ پر خاصا اثر کیا اور مجھ میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگی، بچپن کے آخری اور جوانی کے ابتدائی ایام میں والدین کی سختیاں بڑھ گئیں اور مجھے مجبوراً جھوٹ کہنی پڑی، مدرسہ کے برخاست ہوتے ہی گھر نہ پہنچنے پر پرسش ہو تو "جھوٹ" شام میں دیر تک باہر رہنے کی وجہ دریافت ہو تو جھوٹ، میوہ خوری یا جیب خرچ کے روپئے جو پہلی کو ملا کرتے تھے، مہینے کے پہلے ہی ہفتہ میں ختم ہو جائیں اور دوبارہ مانگنے پر وجہ دریافت ہو تو "جھوٹ" ان دروغ بافیوں نے

اچھا خاصا جھوٹا بنا دیا۔

محرم کا مہینہ ہے مدرسہ غائب کرکے تھوبیک کا رنگ دیکھ رہے ہیں۔ صبح کے گئے واپس ہوتے ہیں تو شام کو وجہ پوچھی تو کہدیا کہ پانچ بجے تک تو مدرسہ میں تھا۔ وہاں سے ذرا مجلس میں چلے گیا تھا اب مجلس سنکر آرہا ہوں چلو چھٹی ہوئی، پانچ بجے چار پی کر گئے اور رات کے نو بجے تک سینما دیکھتے رہے، واپسی پر پوچھا تو کہدیا۔ ایک ہم جماعت کے والد مر گئے تھے راستہ میں میت نظر آئی تو ساتھ ہو گیا اب دفنا کر سب لوٹے تو میں بھی واپس ہوا۔ چلو بچ گئے، رات کو اگر غائب رہنے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے سے یہ کہکر کہ فلاں دوست کے گھر دعوت ہے، نیاز ہوگی رات بھر مولودِ شریف بھی ہوگا۔ چلو اجازت مل گئی رات اپنی۔

جیب خرچ ہیوی خوری کے روپیوں سے خوب سگریٹ پیئے مدرسہ غائب کرکے بارہ دری گئے وہاں مٹھائیاں اڑائیں اب جو روپیئے ختم ہوگئے تو یہ کہکر مطالبہ کیا کہ ڈکشنری کھو گئی تھی ایک نئی خرید لی ہے کاپیوں کیلئے کاغذ اور ڈرائنگ کیلئے برش اور رنگ کا ڈبہ لیا روپیہ نہیں رہے چلئے حساب ہوا اور روپیے مل گئے۔ یہ تھا بچپن کا حال۔

جوانی میں شادی ہونے تک یہی حال رہا۔ میلادِ شریف کے بہانے سے ناٹکیں دیکھیں دوستوں کی شادیوں کے بہانے سے گانے سننے کے مٹھے لے چکے،

دنیا بھر کے کام کیئے۔

شادی ہوتے ہی نگرانی اور سخت نگرانی شروع ہوئی، دفتر سے واپسی میں دیر ہوئی تو پرسش، تفریح سے واپسی میں تاخیر ہو تو جواب طلب، رات کو جانے کی اجازت ہی نہیں اور اگر اجازت کے بغیر غائب رہے تو غضب، آفت، قیامت، سرہانے سے کنجیاں لیکر بیگم صاحبہ نے اٹاچی کیس کھول لیا اس میں سے روپیوں کا بٹوا غائب، اب صبح مانگئے تو پہلے انکار ہوگا آخر مجبوراً اقرار بھی کیا تو روپیے دینے کا نام نہیں۔ مجبور کرنے پر دیا بھی تو صرف ایکروپیہ چلو سستے چھوٹے، بقیہ روپیئے غائب،

ان آفتوں سے بچنے کے لئے جھوٹ نہ کہئے تو کیا کیجئے، یہ تھوڑا ہی کہہ سکتے ہیں کہ رمضان کی ۲۲ تاریخ کو جلسہ ہے گانا ہوگا۔ یہی بہانا کر دیا کہ فلاں دوست کے لڑکے کی روزہ کشائی ہے، چلو رات بھر غائب رہے، اسی طرح جھوٹ کہہ کہکر دن گذارنے پڑتے ہیں۔

مگر اس جھوٹ کا کمال یہ ہے کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہ جھوٹ ہے ایکدفعہ صبح گھر سے نکلے تو ایسے برُے پھنسے کہ تین دن تک گھر لوٹ نہ سکے اب جو واپس آتے ہیں تو قیامت مچی ہوئی کہاں رہے، کدھر رہے؟ کیسے رہے؟ ایسے عجیب وقت میں حواس کا باقی رہنا اور اطمینان کے ساتھ جھوٹ کہنا بھی خاص بات ہے ہم نے نہایت ہی بے اعتنائی سے کہدیا، چچا گھوڑ ریسے

گر گئے تھے۔ "کلم" جیسے تعلقہ پر ڈاکٹر کہاں سیّد میاں کے پاس تار آیا وہ مجھے راستہ میں ملے سیدھے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور وہاں سے ساتھ لیکر "کلم" چلے گیا راستہ میں علیؔ میاں مل گئے تو اُن سے ساٹھ (۶۰) روپیہ لئے جو کرایہ میں کام آئے ورنہ گھر تک چلکر کرنی پڑتی تھی۔ شکر ہے کہ چچا کی ہڈی جڑ گئی اچھا ذرا پانی نکلوا دو۔ نہا کر کپڑے بدل دوں گا اچھا وہ ساٹھ روپیے بھی دیدینا علیؔ میان کو بھیج دیتا ہوں۔ چلئے روپئے بھی ملے خاطر مدارات بھی ہوئی اور حلبہ مفت میں رہا۔

جھٹکا

دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دہ سواریاں دو ہیں۔ شمالی ہند کا یکّہ اور حیدرآباد کا "جھٹکہ" چاہے وہ ربڑ ٹائر ہوں یا لوہا ٹائر اور اس میں "خچر" جتھا ہو یا "یابو" مگر ہیں بدترین سواریاں۔

چاہے "نامپلی اسٹیشن" (براڈ گیج) پر اتریں یا کاچی گوڑہ اسٹیشن (میٹر گیج) پر دونوں جگہ بھی آپ کو ملے گا تو جھٹکا، اس کے موجد نے نام بھی بڑی دوراندیشی سے رکھا ہے، ایسے جھٹکے (دھکّے) لگتے ہیں کہ توبہ بھلی، خدا کا شکر ہے کہ یہ سواری دکن میں سوا حیدرآباد اور مضافات کے کسی اور جگہ نظر نہیں آتی ورنہ ایک مصیبت تھی۔

برادرانِ دکن تو جھٹکے کے جھٹکوں سے واقف ہیں جن حضرات نے اسکی زیارت نہیں کی ہے وہ کسی رسالے میں (چاہے وہ الہ آباد کا ادیب ہو یا حیدرآباد کا دکن ریویو مگر ہو پرانا) چار مینار کی تصویر دیکھ لیں اس میں۔

ایک چھوٹی سی کاٹ کی مزار کسی یابو یا ٹٹو کے سہارے نظر آئیگی۔ وہی جھٹکا ہے۔ آیا خیال شریف میں! یہ بات ابتک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چار مینار کی پرانی تصویریں معہ جھٹکہ سمیت کیوں لگئی ہیں نہ جانے اس زمانے میں جھٹکا چار مینار بنا ہوا تھا یا چار مینار جھٹکا! خیر!

حیدرآباد میں چوکڑے، موٹر، بگھی، (دھمہ اقسام) رتھ، شکرم، ٹانگہ، رکشا، ہنڈی، سبھی کچھ موجود ہیں مگر کثرت ہے تو جھٹکے کی ڈولیاں اور میانے بھی تھے۔ مگر اب ڈولی نظر نہیں آتی۔ میانے صرف شادیوں میں دکھائی دیتے ہیں، رتھیں صرف سرکاری رہ گئی ہیں۔ امراء کے پاس بھی تھیں مگر اب نہیں رہیں، شکرامیں بگھیوں اور موٹروں کی کثرت کی وجہ گھٹتی جارہی ہیں برقعہ گاڑی دکن میں رائج ہی نہیں رہی اورنگ آباد میں کسی زمانے میں نظر آتی تھیں، ابتو وہاں بھی نہیں۔"

موٹروں کی یہ کثرت ہوگئی ہے کہ روشن خیال نوجوانوں سے قطع نظر میانہ نشین بوڑھے بھی اب موٹر پر نظر آتے ہیں۔ ٹیکسی کو پوچھئے نہیں جھٹکوں سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں "لاری" اور "بس" بھی ان گنت ہیں مگر پھر بھی جھٹکے کم نہیں ہوتے "فلک نما" سے "سکندرآباد" تک چلے جائیے جھٹکے ہی جھٹکے نظر آئیں گے۔ حیدرآباد کا متوسط طبقہ جسے لوگ سیکنڈ کلاس بھی کہتے ہیں، جھٹکہ نشین ہے، جسے دیکھئے جھٹکے میں لدا ہوا

نظر آئے گا۔

ہماری صفائی بلدہ (بلدیہ) بھی ستم ظریف ہے۔ سال میں ایک دفعہ نمبر اندازی ہوتی ہے۔ جھٹکہ کا ٹیکس لیکر جھٹکہ والوں کو بلّہ چٹھی (پاس) دیا جاتا ہے اور اس زمانہ میں نگرانی کی جاتی ہے ہر جھٹکا دلہن نظر آتا ہے کبھی دفتر صفائی میں چلے جائیے تو یہ دلچسپ تماشا بھی نظر آئے گا۔ اسیسر صاحب میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ انسپکٹر بھی پہلو میں ہے دو ایک پولیس کانسٹبل بھی موجود ہیں۔ ایک ایک جھٹکا آتا ہے، ڈھانچہ گدّیاں یا بوسازوسامان سبھی چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ ان پر نمبر لگایا جاتا ہے۔ یابو کو دوڑا کر بھی دیکھ لیا جاتا ہے۔ جھٹکہ والے کا خاکی ڈریس بھی ملاحظہ ہوتا ہے اور فیس (ٹیکس) لیکر ایک ٹین کا مربع پلیٹ جس پر "صفائی بلدہ سنہ ۳۴ اف درجہ چہارم نشست چہار اشخاص ۲۲۲۲۰۰۱" لکھا ہوتا ہے اور ایک پیتل کا ٹکڑا جسکے دونوں بازوؤں پر سوراخ ہوتے ہیں اور اس پر بھی یہی عبارت منقوش ہوتی ہے اور ایک "شرح کرایہ کا تختہ" جسکا ترجمہ ہمارے ایک دوست نے کرایہ نامہ کیا ہے دیا جاتا ہے۔ چلو خوشی خوشی جھٹکا چلا۔ اس نمبر اندازی کے زمانے میں جھٹکا والی مخلوق "بڑی بڑی جدّتیں کرتی ہے کوئی تو نہایت ہین ریشم کے پردے ڈال دیتا ہے۔ سازوسامان یا بلدہ جھٹکے کو نہایت شوخ رنگ دیتا ہے گھوڑے کی خوش نصیبی سے اگر سفید ہو تو دُم اسر، پاؤں، رنگ کر پنچ کلیان بنا دیتا ہے

دروازے پر ویلکم یا خوش آمدید لکھوا دیتا ہے۔ بہرحال اس زمانہ میں جھٹکہ دلچسپ نظر آتا ہے،

مگر ادہر نمبر پڑا اور ادہر آہستہ آہستہ سب چیزیں غائب وہی اونگھتا ہوا گھوڑا اور نیم بے ہوش، جھٹکا والا اور جھٹکا ایسا مخدوش اب گرا کہ گرا اسی میں سواری ہو رہی ہے ؎

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشانِ دفاتر بہ روبکار روند

ان غریبوں کو اسی جھٹکہ میں جانا پڑتا ہے دو دو آنے کرایہ کرکے تین اشخاص لد جاتے ہیں اور دفتر پہونچ جاتے ہیں سب سے دلچسپ چیز جھٹکا والا ہوتا ہے انکے کئی اقسام ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قسم کے لحاظ سے ان میں دلچسپی ہوتی ہے۔

(۱) نوجوان لڑکے جو چند روز بھیک مانگنے اور کسی ہوٹل میں نوکر رہکر نکالے جانیکے بعد "آوارہ گردی" کی علت میں چالانِ عدالت ہوکر جھٹکا چلانے والے، یہ عموماً اکھڑ، غصیلے، فطرت کے لحاظ سے لڑاکو اور شریر ہوتے ہیں۔ کرایہ داروں سے لڑنا گالی گلوج کرنا انکے لئے معمولی بات ہوتی ہے۔

(۲) پہلی قسم کے متوسط عمر والے جو زیادہ دنوں تک جھٹکا چلاکر تجربہ کار ضرور ہو جاتے ہیں مگر پرانی عادتیں انمیں بھی موجود ہوتی ہیں!

(۳) نوکری نہ ملنے کی وجہ یا اپنی سستی یا کاہلی کی وجہ جھٹکا چلا کر گذر بسر کرنیوالے یہ لوگ پہلے اور دوسرے طبقے کے جھٹکے والوں سے زیادہ سنجیدہ اور غنیمت ہوتے ہیں۔

(۴) تجربہ کار جہاندیدہ، معمر، باتونی، سزا یافتہ، افیونی، جھٹکے والے یہ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ آپ کسی چوتھی قسم کے جھٹکے والے کو دیکھکر اسکے جھٹکے میں سوار ہو جائیے اور پھر نہایت آہستگی سے پوچھ لیجیے کہ "ملازم ہو یا ذاتی جھٹکا ہے؟" بس اس نے اپنی ساری کہانی شروع کی، از آں دم تا ایں دم ایک ہی سانس میں ساری کہانی سنا دیگا۔ اور بیچ بیچ میں ایسے ایسے دلچسپ حالات، واقعات اور حکایات بھی سناتا جائیگا کہ آپ حیران ہو جائیں گے۔ موسیٰ ندی کی طغیانیاں، طاعون کے دورے سے لیکر انفلوئنزا، ملیریا، قحط، آرائش بلدہ، ہائیکورٹ، سول ہاسپٹل وغیرہ کی تعمیر، ڈیوک آف کناٹ، پرنس آف ویلز، اور چار چھ وائسرائے کی آمد کے جلسے، نمایش، ناٹک، سینما سرکس سے لیکر گنڈی پیٹ اور حمایت ساگر کی تعمیر تک کے دلچسپ حالات سن لیجئے، ہر ایک موضوع پر بلا تکلف گفتگو کرنے والا غیر تعلیم یافتہ اگر کوئی مل سکتا ہے تو وہ جھٹکا والا اور صرف جھٹکا والا ہے۔

خاص خاص لوگوں کے ذاتی حالات عادات و اطوار چال چلن، تمدن و معاشرت کے متعلق کروڑہا قصے سن لیجئے اس سے بحث نہیں کہ وہ خواہ مخواہ

صحیح ہی ہوں مگر اس نفاست سے سنائے جائیں گے کہ سننے والا زبردستی یقین کرے گا۔

مجھے عموماً وحشت ستاتی ہے۔ جب شدت کا دورہ ہوتا ہے تو میں کسی قسم چہارم کے جھٹکے والے کو تاک کر جھٹکے میں بیٹھ جاتا ہوں اور اس سے کوئی ایک سوال پوچھ کر بیٹھ رہتا ہوں۔ بس گویا گراموفون کو کوک دیا۔ سنتے جائیے یہاں تک دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کہ خفقان رخصت ہو جاتا ہے "ویب رونا" شربت کے شیشے ٹنکچر ڈے، جی، ٹینا، کے بڑے بڑے خوراک بھی خفقان کو اس قدر جلد نہیں روک سکتے۔ جتنی تیزی سے کہ ایک جھٹکے والا اپنی دلچسپ اور مزیدار گفتگو سے روک دیتا ہے۔

مئی کے تیسرے ہفتے میں گرمی شدت کی تھی، غالباً جمعہ یا اور کسی تعطیل کا روز تھا۔ مجھے خفقان نے آلیا۔ بارہ بجے سے تین بجے تک تو گھر پر پڑا رہا جب خانہ نشینی خارج از اختیار ہوگئی تو ع

چھڑی ہاتھ میں لیکے گھر سے نکل

چارمینار کی طرف چلا۔ میدان خانکے چوک سے وزیر علیؒ پاشا کی ڈیوڑھی تک بیسوں جھٹکے کھڑے تھے مگر کوئی جھٹکے والا مطلب کا نظر نہ آیا۔ سوکھے حوض کے پاس سحر باطل کی کمان کی طرف چند جھٹکے کھڑے ہوئے نظر آئے، ایک ایک کو دیکھتا ہوا کمان تک جا پہنچا۔ ایک نہایت میلا کچیلا فرسودہ از کار رفتہ

رنگ پریدی، گدیاں پارہ شدہ جھٹکا نظر آیا جس کا یا یو زورزور سے سانس لیکر یہ ضرور ظاہر کر رہا تھا کہ آخری سانس لے رہا ہے مگر نہ تو آنکھیں ہی کھلی ہوئی تھیں اور نہ ہڈیوں پر گوشت ہی تھا۔ ویٹنیری کلاس کے طلباء کے سامنے لیکچر دینے کیلئے اس سے عمدہ ڈھانچہ جسکی ہڈیاں بآسانی گنائی اور دکھائی جاسکتی ہوں اور کوئی نہ مل سکتا تھا۔ لطف یہ کہ اسؔ کاٹ کی مزار میں ایک نہایت معمر ہستی مصروف مراقبہ تھی۔ چھوٹا سا قد، خاصا کالا رنگ، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں رگیں ابھری ہوئیں ہڈیوں کے سوا کسی حصہ جسم پر گوشت کا نام نہیں۔ کثرت ریاضت سے کمر جھکی آنکھیں اندر کو دھسی ہوئی گال چپکے ہوئے۔ تھوڑی پر گنتی کے چند بال بعض سفید بعض کالے باریک باریک مونچھ کانوں کی لوئیں پٹی ہوئیں۔ ایک کالے کرتے پر سرخ صافہ (شملہ باندھے جھٹکے کے ایک کونے میں یہ گٹھڑی کچھ اسطرح رکھی ہوئی تھی کہ ع

ڈاڑھی بھی جو ہلتی تھی تو ہوتا تھا گماں اور

پہلے ہمنے جھٹکے کے تختے کو چھڑی سے ٹھونکا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی آوازیں دیں مگر ع

کچھ ایسا سویا تھا سونیوالا کہ جاگنا حشر تک قسم تھا

آخر ہم نے غریب گھوڑے پر چھڑیاں چلانی شروع کیں۔ چار چھ چھڑیوں کے رسید کرنے کے بعد گھوڑے نے ایک جھرجھری لی۔ گردن،

سیدھی کی اور آہستگی سے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ پے در پے چار چھ دھکّے لگنے کے بعد جھٹکہ والے نے آنکھیں کھولیں۔ بیک لفظ بیس پچیس مغلظات گھوڑے کو سنا دیں اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر پوچھا، میاں جھٹکہ لاؤں؟ ہم نے گردن کے اشارے سے ہاں کہہ دی۔ بڑے میاں نے سنبھل کر شملہ (صافہ) ٹھیک کیا۔ جس میں سے ایک کاڑیوں کی ڈبی، ایک چار مینارہ سگرٹ کی ڈبی ایک کٹہ یادگیری بیڑی کا گدیوں پر گر پڑا۔ شملہ باندھنے کے بعد یہ تینوں چیزیں پھر شملہ ہی میں ٹھونسی گئیں۔ گدیاں جھٹکیں، چابک ڈھونڈ ڈھانڈ کر ہاتھ میں لیا۔ اور دروازہ کھول کر ہماری طرف دیکھنا شروع۔ ہم نے سوار ہو کر دروازہ کا بولٹ لگا دیا۔ اور بڑے میاں نے پوچھا۔ میاں کدھر چلوں۔ ہم نے پہلے تو کچھ سوچنا چاہا۔ مگر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ یکایک زبان سے نکل گیا "کاروان"[1] بڑے میاں نے جھٹکا پلٹایا اور گھانسی کے بازار محبوب کی مہندی کا چکر دیکر حسینی علم کی سڑک پر پہنچے اور اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو شروع کی کہنے لگے۔

"میاں! مہندی کے موڑ پر آپ نے تبنیوں (کھڑکیوں؟) والا مکان دیکھا۔ اس میں باہر والی ایک کسبن (کسبی) آکر ٹھیری ہوئی ہے۔ صورت تو کچھ اچھی نہیں مگر آنکھیں غضب کی ہیں۔ بڑی صاحب جان کے بعد میں نے آنکھیں دیکھیں تو بس اسی کی۔ گلا بھی اچھا ہے۔ ناچتی بھی ہے مگر کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لوگ اسی پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ آٹھ دس دن سرور نگر میں تھی

[1] زبان کے ذمہ دار ہم نہیں۔ جملہ حقوق بحق جھٹکہ والا محفوظ۔

نواب ۔ جنید بہادر نے بلالیا تھا۔ ہزاروں لیکر آئی ہے مگر میاں جاتے وقت جو رونق منہ پر تھی اب نہیں رہی۔ ہزاروں روپے چپ (مفت) تھوڑا ہی ملتے ہیں آدھی ہو کر آئی ہے یہاں کوئی بھی کسبن اچھی آجائے تو یہی حال ہوتا ہے اجڑے گاؤں میں گدھی سہاگن کا حال ہے شہر میں کسبنیں (کسبیاں) ہیں کہاں بتو ایک بھی نہیں پرسوں ہی کی بات ہے کہ چار مینار کے چاروں کونے آباد تھے۔ صبح سے شام تک بنگلوں (کوٹھوں) پر کسبن ہی کسبن نظر آتی تھی۔ مگر ان پولیس والوں نے غریبوں کو نکالا۔ بیگم بازار، سدی عنبر کا بازار، موسیٰ باؤڑی (باؤلی) پر جاکر رہ گئیں۔ مگر عماد جنگ بہادر نے وہاں بھی چین لینے نہ دیا وہ وہ تکلیفیں دیں کہ ایک ایک کرکے سب بھاگ گئیں جو بچیں وہ مر کھپ گئیں۔ ہائے میاں! بھارجی کا طائفہ، کالی جان کا گھرانا، صاحب جان کا طائفہ موتی جان کا بنگلہ سب تباہ ہو گئے۔ ظالموں نے ایک کو بھی نہیں چھوڑا اب دو چار کالی پیلیاں سدی عنبر کے بازار میں اور چار چھ گولی گوڑے میں، دو ایک بیلے میں رہ گئی ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ بھی کسی کام کی نہیں رہیں نہ تو گانا آتا ہے اور نہ [illegible] ۔ صورت نہ شکل باہر سے آجاتی ہیں تو سال چھ مہینے خوب قدر ہوتی ہے مگر اس کے بعد لوگ ستانے لگتے ہیں اور وہ ٹکنے نہیں پاتیں۔ یہ بی جان جواب آئی ہوئی ہیں چند ہی روز میں ایسی بھاگینگی کہ پلٹ کر نہیں دیکھینگی۔

پہلے زمانہ میں ہر رسم میں شادی ہو چاہے بسم اللہ ہو۔ کسبیوں کا رہنا لازمی تھا۔ براتوں کے ساتھ "تختِ رواں" رہتے تھے، اس پر طائفے کے طائفے ہوتے۔ ورنہ ہاتھیوں پر کسبنیں بٹھا دی جاتی تھیں، کیسے کیسے دھوم کی باراتیں نکلتی تھیں۔ آخری شادی دھوم دھام سے بس نواب مظفر جنگ کی ہوئی تھی اس کے بعد سے اب تک کوئی دھوم دھام کی شادی دیکھنے میں نہیں آئی۔

درگاہوں کے جھگڑے بھی موقوف ہو گئے وہاں تو کسبنیں پھٹکنے بھی نہیں پاتیں۔ ہولی دیوالی میں سیٹھ ساہوکاروں کے پاس بھی گانے کا دستور نہیں رہا۔ چار بجلی کے گولے لگائے اور گراموفون لگا کر بیٹھ گئے دیوالی ختم، شادیوں میں بڑی دھوم دھام کی تو ایک قوالی کی چوکی بلوا لی بس ..... ناٹک ایسی نکلی کہ ان غریبوں کی آمدنی بیٹھ گئی۔ پہلے جب ناٹک تھی نہ سینما تھے لوگ مغرب کے بعد ٹہلتے ہوئے بنگلوں پر چلے جاتے تھے بیٹھکر گانا سنتے آٹھ نو بجے گھر واپس چلے جاتے!

آجکل لوگ گھر سے نکلتے ہیں تو سیدھا ہوٹل کو جاتے ہیں یا سینما دیکھکر نو بجے گھر کو پہنچ جاتے ہیں وہاں گانا اور ناچ بھی ہوتا ہے۔ بعض سینما والوں نے دو دو تین تین مرکیاں بلا لی ہیں، انہیں ناچنا گانا سکھلا دیا ہے۔ بھلا یہ دھیڑنیاں کیا ناچینگی؟ سینما میں انہیں کو نچوا گوا دیتے ہیں لوگ

اسی پر خوش ہیں۔ کہیں مس تارا کا ناچ ہے تو کہیں مس موہنی کا جا کر دیکھو تو غصہ آنے لگتا ہے۔ کاماٹی پورے سے مُرلیوں کو لاکر مس مس بنا ڈالا۔ لوگ ہیں کہ اسی پہ مٹے ہوئے ہیں۔"

" میاں! آپ لوگ بھی آجکل کے بچے ہیں۔ کسبنوں کو برا سمجھتے ہونگے مگر میاں سدا سہاگن کچھی ہوتی ہیں پچھی دیکھو نا ادھر چارمینار سے کسبنیں نکالی گئیں اُدھر جھاڑو تارا" (دُمدار ستارا) نکلا، ادھر تارا نکلا، اُدھر مرحوم سرکار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد سے طاعون، ہیضہ، ملیریا، انفلوئنزا، مونیا، قحط، اَلا بَلا سبھی آنے لگے۔ سچ کہتا ہیں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا ہوں اب دکانیں بہت زیادہ ہوگئی ہیں۔ لوگ بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ شہر سجایا جا رہا ہے۔ سیمنٹ کی سڑکیں بنگئی ہیں۔ راستے میں بجلی کی روشنی لگ گئی ہے۔ مگر چار مینار کو دیکھو تو ہُو نظر آتا ہے وہ رونق ہی نہیں جو کسبنوں کے زمانے میں تھی اب کسی بنگلے پر "فقیری چٹکلے" کا تختہ لگا ہوا ہے تو کسی بنگلہ میں "انجمن تجہیز و تکفین" ہے ایک کونے میں کچھ اچھے سے نام کی ایک کفن کی دوکان ہے ایک صاحب نے اس کا "مُستقیم سیدھی سڑک" نام بتایا تھا معلوم نہیں نام کیا ہے مگر وہاں بھی رانده، عبیر، کافور، کفن ملتا ہے۔ نیچے کچھ چائے خانے کچھ پھول والوں کی دکانیں ہیں اور کچھ نہیں۔ چار مینار کے کونوں پر عنابل بیٹھے ہوئے نظر

---

۵۷ صراطِ مستقیم۔

آتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رنڈیاں چلی تو گئیں مگر موت کو چھوڑتی گئی ہیں جو چار مینار کی نگہبانی کر رہی ہے۔ اللہ اللہ کیا سے کیا ہو گیا۔"

"قوالوں کے قدرداں بھی نہیں رہے۔ صرف دو ایک چوکیاں رہ گئیں اور باقی سب مر کھپ گئے مراسنوں کا تو خاتمہ ہو گیا۔ اب صرف دو تین طائفے رہ گئے ہیں اور وہ بھی چند روز کے مہمان ہیں۔ جھانگڑنیاں تو اب نظر ہی نہیں آتیں۔ کیا کہوں۔ کیا کیا ہوا ہے۔ شہر میں مُرلیوں سے بھی ایک جوبن تھا۔ مگر پولیس والوں نے اسے بھی نہ چھوڑا۔ مُرلی بنناہی سرے سے بند کر دیا۔ پرانی دھرانی جو تھیں وہ مر کھپ گئیں، انکی اولاد مُرلی نہ بن سکی، ہائے میاں! کیسی کیسی مُرلیاں تھیں۔ مگر اب گھس کر لگانے بھی نہیں ملتیں۔ پر[1] آنے پیر کی قسم رونا آتا ہے ان باتوں کو یاد کر کے ......"

"میاں یہ سب بربادی انگریزوں نے پھیلائی۔ انھوں نے مدرسے کھلائے لوگ لگے انگریزی پڑھ پڑھ کر کرسٹان بنّے۔ باوا دادا کے طریقوں کو چھوڑ کر انگریز بنگئے۔ بچوں کو انّا کے بدلے ڈبّے کا دودھ پلانے لگے۔ کھلائی کے بدلے آیا مقرر کرنے لگے۔ گھر میں مغلانی ہی نظر نہیں آتی۔ درزی کپڑے سی دیتا ہے گھوڑا، گاڑی، پالکی، میانہ سب چھوڑ کر موٹریں رکھ لیں۔ چلو صاحب بن گئے اس سے کتنوں کا پیٹ مارا گیا؟ بچے والی غریب عورتیں انّاگیری کرتی تھیں

---

[1] غوث اعظم رضی اللہ عنہ ۔ ۵۲ کرسچین۔

غریبوں کی بہو بیٹیاں کہلائی پن کی نوکری کر کے زندگی گذار لیتی تھیں سینا پرونا جاننے والیاں معلانی کی نوکری کر لیتی تھیں۔ گاڑی گھوڑے پر سائیں کوچوان اور پالکی پر پیادہ اور بھوئی وغیرہ پیٹ پال لیتے تھے مگر اب تو کچھ بھی نہ رہا غریب بھوکے مرنے لگے۔ بیوائیں یہ چکیاں پیس کر گذران کر لیتی تھیں اگر اب بجلی کی چکیوں[ا] نے ان کے پیٹ پر بھی پاؤں دیدیا۔ بیچاریاں چکیاں چھاتی پر رکھ کر بیٹھ رہیں۔ اب فاقے کر رہی ہیں۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔ تمام بیواؤں کو تنخواہیں کر دیں۔ گذارے مقرر کر دیئے جسکی وجہ روٹی کا سہارا ہو گیا۔ ورنہ بیچاریاں کب کی مر گئی ہوتیں ...... آرائش بلدہ کے کام جو ہونے لگے تو غریبوں کو مزدوری مل گئی۔ مٹی ڈھو کر، پتھر پھوڑ کر کام کاج کر کے پیٹ تو پال لیتے ہیں ورنہ اسکا بھی سہارا نہ تھا۔"

جھٹکے والے کی مسلسل تقریر نے مجھے کچھ ایسا لطف دیا کہ میں لگا اونگھنے نہ جانے کتنی دیر اونگھتا رہتا۔ یکایک ایک زوردار ہچکولے نے چونکا دیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک چھوٹی سی "آسٹن" موٹر اور جھٹکے میں تصادم واقع ہو گیا ہے خیر یہ گذری کہ موٹر کا اگلا مڈگارڈ جھٹکے کے پہئے سے ٹکرایا اور کچھ نہیں ہوا۔ موٹر جھٹکے سے چھوٹی تھی اگر کوئی بڑی بھاری کار ہوتی تو "افضل گنج" کے دواخانے کو جانا پڑتا۔ زبردستی جھٹکے والے نے الٹا "شوفر" کو ڈانٹنا شروع کیا

[ا] فلور ملز۔

وہ سکے جا رہا تھا کہ تو اونگھ رہا تھا تو پینک میں تھا تو نے "سانڈ" چھوڑ دی مگر جھٹکے والے سنتے تھوڑا ہی ہیں۔ وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ سننے والوں کے کان بھی پناہ مانگنے لگے۔ بے پناہ انداز میں ایسی ایسی گالیاں دیں کہ کچھ نہ پوچھو۔

اِن جھٹکہ والوں کو سانڈ سے جھٹکا چلانے کی عادت ہی نہیں جب دیکھو غلط چلینگے۔ سب بائیں سے چلیں تو یہ دائیں طرف چلیں گے۔ موٹر پر سب سواریاں آہستہ چلینگی۔ مگر جھٹکا نہایت تیزی کے ساتھ اسی طرح سیدھی سڑک پر سب سواریاں تیز تیز گزر جائینگی مگر جھٹکہ نہایت ہی آہستگی سے "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کہتا ہوا گزریگا دنیا بھر کے "بان" فیل بان، شتربان، رتھ بان، ٹمٹم بان، گاڑی بان موٹربان (شوفر یا ڈرائیور) سب خاموشی سے اپنی سواری ہانکینگے مگر جھٹکا والا چپ ہو ہی نہیں سکتا۔ سکے جائے گا۔ اندر بیٹھی ہوئی سواریوں سے گفتگو کرے گا وہ مخاطب نہ ہوں تو گھوڑے یا گھوڑی کو جو بھی جھٹکے میں جُتا ہوا یا جتی ہوئی ہو گالیاں دیگا۔ ننھال کے سات پشت ددھیال کے چودہ پشت اور اسکی مادہ سے لیکر مالک در پرورش کنندہ تک کو سناتا جائے گا۔ اگر جب بھی جی نہ بھرے تو کسی نہ کسی کو ٹکر ضرور دیگا اور پھر اسے گالیاں سناتا رہیگا۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو گائے گا۔

"وہ لیلیٰ تھی کہ جسکو مل گیا مجنوں مقدر سے"

"اب سوگ میں تم کس کھولے ہوے بال آے"

سبھی سُن لیجئے۔ آواز ایسی پاٹ دار کہ سُبحان اللہ! "مدک" پینے والوں میں نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ آواز خوب "بن جاتا" ہے انہی حرکات کی وجہ جھبکا والا مشہور ہے۔ حیدرآباد میں یہ حرکات صرف اسی ہستی سے منسوب کیجاتی ہیں جو جھبکا چلاتی ہو۔ اگر کوئی اور شخص بھی ان میں سے کوئی ایسی بات کرگذرے جو خلاف طبع احباب ہو، یا انکی نظروں میں بُری ہو۔ تو اسے فوراً "جھبکا والا" کہدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے ایک بے تکلف دوست کو تفریح کے وقت لب سڑک گانے پر "جھبکا والا" کہا۔ تو وہ ایسے بگڑے کہ ملنا ہی چھوڑ دیا۔

دنیا کی تمام بُرائیاں تمام خرافات آپ انہیں دیکھ لیجئے چھیڑ کر یہ لڑینگے راستہ روک کر یہ کھڑے ہونگے، عمداً یہ ٹکر دینگے جان بوجھ کر کہ پیچھے ہی سائیکل تیز آرہی ہے یہ جھبکا روک لینگے۔ ہر شریف آدمی سے کرایہ پر تکرار کرینگے مگر ساتھ ہی ساتھ چوتھی قسم کے جھبکے والے ایسے نظر نہیں آئینگے اور سب باتیں ان میں بھی کچھ کچھ ملینگی۔ مگر ہمدرد، ملنسار کسی قدر خلیق۔ سیدھے سادے بھولے بھالے بھی ہونگے اور ایسے قابل اعتماد کہ آپ ایک دفعہ کی جان پہچان کے بعد قیمتی چیزیں جھبکے میں رکھکر گھر بھجوا دیجئے بکمال امانت گھر پر پہنچادیں گے۔

مگر یہ کوئی بات نہیں ہر کلیہ کا مستثنیٰ ہوتا ہے بعض جھٹکے والے اچھے
نکل جاتے ہیں اور بعض اچھے لوگ "جھٹکے والے" ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ
موٹروں کی کثرت جھٹکوں کو کم کر رہی ہے۔ آئندہ پچیس سال کے بعد
شاید جھٹکا قدیم تصویروں ہی میں نظر آئے تو آئے ورنہ اسکے باقی رہنے کے
آثار تو نہیں ہیں اچھا بھی ہے۔

خس کم جہاں پاک

گھبراہٹ

زندگی یا تو امیروں ہی کی اچھی ہوتی ہے یا غریبوں کی متوسط طبقہ ہر حال میں بُرا ہر طرح غریب کی مرن ہر حال میں خرابی۔ امراء موٹر نشین ہیں بگھی نشین ہیں یا ہر طرح کی سہولت ہے۔ غربا پیدل ٹاپتے پھرتے ہیں۔ انہیں کوئی عار نہیں کوئی اُن پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ مگر خرابی بیچارے متوسط الحال یا (مفلوک الحال) لوگوں کی ہے۔

سیّد اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

خیر وہ تو سرسیّد تھے جن کے گزٹ پر لاکھوں مل گئے مگر انہیں کے لوگ (اولادِ معنوی) نیم سرکاری مراسلہ لیکر نکلتے ہیں تو کروڑہا روپیہ ملجاتا ہے اور ہم ہیں کہ پڑے ٹانگیں رگڑ رہے ہیں۔ اور کس نمی پُرسد کہ بھیّا کون ہو؟

دفاتر دور اوقات کی پابندی میں سختی۔ غیر حاضری اور دیر حاضری

کا ڈر۔ با ایں ہمہ پیدل ٹاپنے کے عوض قرض وام کر کے ایک ٹوٹی پھوٹی سائیکل لے لی تو غضب ہو گیا۔ غلط راستہ (رانگ سائڈ) چلو تو وہیں ایک پولیس کے جوان نے ڈانٹ بتائی اور واپس کر دیا۔ قندیل ذرا دیر کیلئے روشن نہ ہو یا ہوا سے بجھ جائے تو بس دھر لئے گئے یا تو تھانہ میں شب بسری کر کے صبح صدر امین کو توالی کی منت خوشامد کیجئے یا سائیکل کو عوض رو برو رکھوا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پیدل گھر کو سدھاریئے اور دوسرے روز رخصت اتفاقی لیکر امیں کچہری اور عدالت کے چکر کاٹئے پھر جرمانہ ادا کر کے ہائی پائیے

چاہے آپ کے کپڑے سفید ہوں یا میلے اچھے ہوں یا برے مگر چھکڑ کاؤ کے موٹر کے گذرنے کے وقت سائیکل سے اتر کر کونے میں دبک رہیے ورنہ نصف آخر یعنے ایڑی سے کمر تک کا حصۂ جسم تر بتر نظر آئے گا۔ چھکڑ کاؤ کی موٹر کا شوفر آپ کو سائیکل سوار سفید کپڑے پہنے ہوئے دیکھکر بکمال لطف مہربانی ذرا آہستہ بھی چلائے گا۔ اور آپکے قریب سے لیجائے گا۔ اور پانی بھی اسوقت خوب اچھلتا نظر آئے گا مختصر یہ کہ آپ بھیگی بلی بنے ہوئے گھر تشریف لیجائیں گے۔

بارش ہو چکی ہو سڑکوں پر کیچڑ ہو اور بعض بعض گڑھے پانی سے بھرے ہوئے ہوں آپ سفید پوشی کے ساتھ سائیکل پر بیٹھے ہوئے ہوں تو ہر موٹر چلانے والا چاہے وہ ذاتی موٹر کا مالک ہو یا کسی کا شوفر یا

ٹکسی کا ڈرائیور کوئی ہو موٹر کو آپ کے قریب سے اور اس قدر قریب سے تیز بلکہ تیز تر اسطرح لیجائیگا کہ آپ سر سے پاؤں تک کیچڑ زدہ نظر آئیں گے نہ صرف ٹوپی بلکہ عینک ناک مونچھ اور شیروانی۔ پائجامہ جوتے تک چھینٹوں سے پُر نظر آئیں گے۔

آوارہ گرد لونڈے، ہشتین۔ ریٹائر بوڑھے۔ پچپن سالہ عورتیں یہ سب آپ کو بیچ سڑک پر سے چلتے ہوئے ملیں گے۔ آپ گھنٹی بجائیں چیخیں چلائیں ڈانٹ ڈپٹ کریں مگر کچھ اثر نہ ہوگا۔ وہ یقیناً آپکی سیکل سے ایک اولے کے ساتھ ہم آغوشی کیلئے تیار رہیں گے۔ اگر آپ کی سیکل کے پہیئے نے یا ہانڈل نے ذرا بھی چھوا تو بس غضب ہوگیا۔ چیخ پکار شروع ہوگئی۔ کوئی اس پیدل سے نہ پوچھیگا کہ تو بیچ میں کیوں آیا گھنٹی کی آواز سنکر ہٹا کیوں نہیں۔ بس آپ سے اور صرف آپ سے سوالات ہونگے اور آپ پولیس میں جائینگے۔ اسوقت نہ تو سائڈ پوچھی جائیگی اور نہ گھنٹی کا سوال ہوگا۔

کسی کی سواری آنیوالی ہو تو سب سے پہلے سیکل سوار روکے جائیں گے۔ چاہے وہ آنیوالا بنگال کا گورنر ہو یا مدراس کا میسور کا وزیر اعظم ہو یا ہندوستان کا چرخہ بردار (گاندھی) مگر آپ سب سے پہلے سیکل سے اتارے اور روک لئے جائیں گے۔ موٹر نشین جم جم جائیں گے۔ موٹر سیکل سوار ڈنکے کی چوٹ پھر ینگے۔ بگھی نشین بیچ کھیت گزریں گے ایک آدھ پیدل بھی چلے جائیگا مگر آپ مخفی

اس علت میں آگئے کل سواریں روک دیئے جائینگے۔

اگر کسی سڑک پر نالی بنائی جارہی ہو یا آدھی سڑک زیر تعمیر ہو تو ایکطرف لکڑیاں لگاکر آدھا راستہ روک لیا جائیگا۔ سرخ کپڑا بھی بعض وقت لگایا جائیگا ایک دو دفعہ سرخ قندیل بھی نظر آئے گی۔ مگر ایک پولیس کا جوان تقریباً دن بھر میں (۸) گھنٹے ضرور کھڑا ہو راستہ چلنے والوں کو ستائے گا۔ جھٹکہ گذرجائے بنڈی آجائے۔ موٹر چلی جائے۔ موٹر سیکل گذرجائے بگی پار ہو جائے۔ پیدل گذرتے رہیں مگر آپ نے قدم رکھنے کا ارادہ کیا کہ اس نے بکمال "اڈوانٹیت" ہاتھ بتاکر آپ کو روک دیا اور لگا منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر ڈانٹنے "حضت اتر کر جائیے گڑبڑ زیادہ ہے" چلو جیتھی ہوئی ہاتھ میں سیکل پکڑے ٹاپ رہی ہیں۔

افضل گنج کی مسجد سے سدی عنبر کے بازار کی طرف جانے کا ارادہ ہو تو پہلے چار آنے کے پیسے پنکچر جڑوانے کیلئے جیب میں رکھ لیجئے ادہر آپ نے قدم رکھا ادہر کیلا چبھا ہوا اندر وا ب آپ سیکل ہاتھ میں پکڑے ڈھونڈ رہے ہیں دکان سیکل ساز کی۔ لوہاروں کی دکانیں۔ لوہے کے پرانے سامان کی دکانیں دونوں طرف تہیں مگر اب صرف ایک طرف ہیں۔ راستہ کیلوں سے بھرا ہوا ملے گا نہ تو یہاں کبھی جھاڑو ہوتی ہے نہ ہونے کا امکان ہی اور نہ ہوگی

جناب اب یہ سڑک درست ہورہی ہے۔ خدا کرے جلد مکمل ہو۔

اور نہ جھاڑو سے ان کیلوں کا سدباب ہوگا۔ اور نہ تو آپ حفاظت کے ساتھ اس راستہ سے گذرے ہیں نہ گزرینگے۔

ڈرینج کی نالیوں کے کیلئے جا بجا گلیوں میں سڑکوں پر گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ مگر نہ تو کسی جگہ سرخ قندیل ہی نظر آئے گی اور نہ محفوظ باڑھ ہی آپکی سیکل پیدل یا معمولی ڈنہل کی باڑ سے ٹکرائے تو آپ اطمنیاں سے گڑھے میں جا رہیں گے۔ آپ کا سر پھوٹے دانت ٹوٹیں ہڈی پسلی گولہ ہو جائے سررشتہ ڈرینج کی جوتی سے اسے تو کام ہے نالیوں کے بنانے سے۔ اجی حضرت انہیں نالیوں پر آپ کی حفظان صحت کا دارومدار ہے جب نالیاں بن جائینگی تو پلیگ آئے گا اور نہ ملیریا اب رہا آپ کا سر پھوٹنا دانت ٹوٹنا یہ سوال ہی فضول ہے۔ میاں دانت اور سر اور ہڈی پسلی جان سے پیاری ہے ٹوٹی ٹوٹی لاحول بھیجو اجی جان بچی لاکھوں پائے!

آذر[1] کے ابتدائی ہفتہ میں کم از کم چار روز کی رخصت اتفاقی لیکر صفائی بلدہ کے دفتر کو جا یا کیجئے پہلے روز آپ کو کلیننگ ٹکس خالی ملے گا۔ دوسرے روز اس قدر بھیڑ رہے گی کہ آپ تین گھنٹے انتظار کر کے لوٹ آئیں گے تیسرے روز آپ کو ٹکس کے منشی صاحب ہدایت کر دینگے کہ حضت پرانا پلیٹ لائیے نمبر مکانات بتلائیے سمت حلقہ بھی لکھا دیجئے چوتھے روز آپ ہر طرح سے لیس ہو کر جائیں تو صبح نو بجے سے شام کے پانچ بجے تک ٹہرنے کے بعد ایک

[1] سنہ فصلی کا پہلا مہینہ ۱۲

پلیٹ[۱] نمبر کا ملے گا۔ اور وہ بھی مفت نہیں ایک روپیہ آٹھ پیسے دینے کے بعد جس کو آپ جھٹکہ کے نمبر کی طرح سیکل کے پہیئے میں کماڑیوں سے لگا دینگے چیٹھی یعنے رسید موڑ توڑ کر جھٹکے والے کی طرح جیب میں رکھ لیں گے اور گھر جائیں گے کہ کچھ ہو نمبر تو لے لیا اب سال بھر کی بے فکری ہے نمبر اور چیٹھی دونوں کے پاس ہو گی۔ صرف آپ میں اور جھٹکہ والے میں ایک "تانے" کا فرق ہو گا، دفتر میں یا تو اپنے صیغہ میں گاڑی لیجائیے یا باہر رکھ دیجئے کبھی آپ کا قفل چوری جائے گا کبھی قندیل جاتی رہے گی۔ کبھی کوئی نیک بندہ ازراہِ تفریح سوئی چبھو کر پنکچر کر دے گا۔ اگر سیکل عمدہ اور قیمتی ہے تو کوئی نہ کوئی لیکر چلتا بنے گا۔ آپ درخواست دیں گے آپکے افسر اعلیٰ ایک نیم سرکاری کوتوالی بلدہ کو بھی لکھدیں گے۔ مگر فضول نہ تو سیکل واپس ملی ہے نہ ملے گی۔ آپ روئیں گے دھوئیں گے اور خاموش ہو رہینگے۔

یہ ہیں برکتیں سیکل سواری کی اور یہ آفتیں نازل ہوتی ہیں سیکل سوار پر

ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نا رسیدہ می پرسد "کہ یہاں سیکلاں" کجا باشد

اگر اس پر بھی آپ نے سیکل پر سواری کی تو آفریں ہے آپ کی ہمت پر اچھا ہے مزے کیجئے کسی نے کہا ہے نا ع۔ بے حیا باش و بادشاہی کن!

---

[۱] اب ڈکس دیئے جا رہے ہیں جن کی قیمت ۸ ؎ لیجاتی ہے

خواہ مخواہ

دنیا میں اگر کوئی طبقہ خطرناک اور تکلیف دہ ہے تو یہی ہے ایک شریف آدمی کیلئے اس طبقہ کی موجودگی اسی قدر خطرناک ہے۔ جسقدر نمونیہ کے مریض کیلئے سردی۔ لطف یہ ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں اس طبقہ کے افراد بھرے پڑے ہیں۔ اور ممالک میں کم ہیں مگر اسلامی ممالک میں کثرت سے اور خصوصاً ہندوستان انھیں سے بھرا پڑا ہے۔

چاہے آپ ریل میں سفر کر رہے ہوں۔ یا راستہ سے پیدل گذر رہے ہوں۔ دفتر میں بیٹھے ہوں یا کسی رسٹوران میں چائے پی رہے ہوں۔ یا دیوانخانے میں بیٹھے لکھ رہے ہوں۔ کسی وحشتناک اور خاموش سڑک پر چل رہے ہوں۔ کوئی نہ کوئی خواہ مخواہ ضرور مل جائے گا۔ ریلوے سفر میں بدنصیبی سے تھرڈ کلاس کی آفت نازل ہو جائے تو سارا ڈبہ ایکو خواہ مخواہوں سے بھرا ملیگا۔ ایک آپ کا نام پوچھیگا۔ ایک مقصدِ سفر دریافت کرے گا۔

ایک آپکے واٹر باٹل میں سے پانی نکال کر پینے لگے گا۔ ایک بلا تکلف پان اور سگریٹ مانگ لیگا۔ اگر کہیں آپ نے اس بے تکلفی کو بڑھنے دیا اور پھر ہونے لگی ناشتے یا کھانا کھانے کی تیاری اور تکمیل ضابطہ (مفت کرم داشتن) کیلئے آپ نے انہیں دعوت دیدی تو پھر یہ ٹوٹ پڑے چاہے آپکے پاس بڑا ٹفن باسکٹ ہو یا الومنیم کا توشہ دان، بہرحال سبھی خالی ——— اور آپ مقامِ مقصود پر بھوکے پہنچیں گے۔

بد نصیبی سے ہمیں ہمیشہ بلکہ روزانہ دو چار خواہ مخواہ مل جاتے ہیں لاکھ جتن کئے ہزار احتیاط کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ تھرڈ کلاس میں سفر کرنا ہم نے اسی وجہ سے چھوڑ دیا کہ ہمارا توشہ ان لوگوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ ہاتھ میں اخبار یا کتاب ہو تو چھن جاتی تھی۔ پانوں کی ڈبیہ اور سگریٹ کا ڈبہ خالی ہو جاتا تھا اور سب پر طرہ یہ کہ دماغی اور روحانی کوفت اس قدر کہ ہم دو چار روز کیلئے مضمون لکھنے کے قابل نہیں رہتے تھے۔

ایک دفعہ ہم حیدرآباد سے عثمان آباد جا رہے تھے کہ ایک خواہ مخواہ نے بیگم پیٹ اسٹیشن سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو واڑی جنکشن تک چپ تک لینے نہیں دیا۔ واڑی پر ہم نے ٹکٹ بدل لیا اور سکنڈ کلاس میں جا کر بیٹھ رہے۔ تب کہیں اطمینان نصیب ہوا۔ اگر تھرڈ کلاس میں دوست احباب کے ساتھ سفر کیا جائے اور پانچ سات آدمی ایک جگہ بیٹھکر

ہنسنے کھیلنے لگیں تو ان لوگوں سے چھٹکارا ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

بعض دفعہ سکینڈ کلاس بھی انہیں حضرات سے بھرا ہوا نظر آتا ہے ایک زمانہ میں ہم پونہ میں تھے اور مقامی لباس کے استعمال کا شوق تھا۔ چنانچہ جب ہم نے پونہ کو خیرباد کہا اور حیدرآباد کا قصد کیا تو اسی مرہٹہ لباس میں اسٹیشن پہنچ گئے۔ بعض ہندو احباب بھی ہمیں خدا حافظ کہنے کیلئے اسٹیشن پر آ گئے تھے۔ رات کا وقت اور گرمی کا موسم تھا ہم نے سکینڈ کلاس کا ٹکٹ لے لیا اور سوار ہو گئے۔ احباب نے خدا حافظ کہا ٹرین چلنے لگی۔ ایک الفربہ خواہ مخواہ مرد مسلمان بیٹھے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے ٹرین کے چلنے کے بعد ہم نے ایک سیٹ پر بیٹھکر اپنا بستر کھولنا چاہا تھا کہ آپ مخاطب ہو گئے فرمانے لگے۔ کہاں جائینگے راجہ! ہم نے کہا "جناب ہم مفلس ہندوستان کے ایک قلاش مزدور ہیں راجہ نہیں" فرمایا "نہیں مہاراج" ہم نے تعظیماً آپکو راجہ کہا تھا" ہم نے کہا حضور اب تو آپ نے راجہ سے مہاراجہ کر دیا۔ بھلا ہندوستانی غلاموں کیلئے یہ طریقہ تخاطب کچھ ٹھیک ہے" فرمانے لگے۔ راؤ صاحب" ہم نے بات کاٹ کر کہا "جناب راؤ صاحب کا خطاب ہمیں ابتک نہیں ملا اور نہ مل سکتا ہے" بات بڑھنے لگی دو ڈھائی گھنٹے اسی ردو قدح میں گذر رہے۔ بالآخر مولوی صاحب تھک کر سو رہے ہم نے بھی اپنا بستر جما لیا۔ صبح آنکھ کھلی تو مولوی صاحب میٹھی میٹھی نیند سو رہے تھے

ہم نے لباس بدل لیا اور جانماز بچھا کر فریضۂ فجر ادا کرنا شروع کیا۔ چونکہ بدنصیبی سے ہم نے ایک مولوی کے گھر میں جنم لیا ہے اور بچپن سے خاندان بھر کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی لئے ہمیں بھی نماز کی عادت ہو گئی ہے اور ہم بالجہر اقامۃ کہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید ہماری اقامت گوئی پر مولوی جی جاگ پڑے اور لگے حیرت و استعجاب سے دیکھنے جب ہم نے نماز ختم کی اور سگرٹ جلا کر پینا شروع کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کیا آپ نو مسلم ہیں۔ کہئے ہم کیا جواب دیتے۔ عرض کیا ہمارے سات کیا بلکہ چودہ پشت میں بھی کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ صرف ہمارے جد اعلیٰ حضرت علی علیہ السلام نے البتہ نو مسلم ہونے کا امتیاز حاصل کیا تھا۔ ان کے بعد سے ہر بیٹا اپنے باپ کے مذہب پر قائم ہے کسی نے دوسرا مذہب قبول نہیں کیا۔ فرمانے لگے ماشاء اللہ آپ سید ہیں۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب نے بس ہمیں صیغۂ استفسار بنا ڈالا۔ آپ کا نام، آپ کے والد کا نام، آپ کا وطن، پیشہ، عمر، لیاقت خاندان سکونت سبھی کچھ پوچھ لیا۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ کرڈوواڑی پر ڈبہ بدل لیا جائے ورنہ حیدر آباد پہنچنے تک حضرت چین نہ لینے دیتے، ایسے حادثے ہم پر ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں گذر چکے ہیں۔ صبح کے دفاتر میں گھر سے نکلنے میں دیری ہو گئی ہے۔ آپ نہایت تیزی سے بھاگ رہے ہیں کہ دیر حاضری نہ ہو جائے۔ مگر راستہ میں ایک نہ ایک خواہ مخواہ ضرور مل جائیگا

پھر کیا ہے! سلام علیکم، مزاج شریف، مولنا ذرا توقف فرمائیے۔ ارے آپ اتنی صبح جلدی جلدی کہاں جا رہے ہیں۔ خیر تو ہے۔ اچھا تو گویا صبح کے دفاتر ہیں۔ آپ سے تو اب ملاقات ہی نہیں ہوتی پہلے تو کبھی کبھار مل بھی لیتے تھے۔ اچھا یہ تو فرمائیے کہ سبع معلقہ کا سب سے اچھا ترجمہ کس نے کیا ہے مجھے شدید ضرورت ہے کہاں سے ملے گا۔ آپ کے پاس کوئی نسخہ ہے کیا؟ انہی باتوں میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ آپ ان سے پیچھا چھڑا کر دفتر پہنچے ہیں تو آدھ گھنٹہ لیٹ!

چاہے آپ بغیر ناشتہ کئے دفتر گئے ہوں۔ اور دوپہر میں بھی کچھ کھایا نہ ہو۔ چار بجتے ہی بکمال گرسنگی گھر کی طرف دوڑے جا رہے ہوں۔ اس سے بحث نہیں کہ آپ کا چہرہ اترا ہوا ہے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں پریشان جا رہے ہیں۔ خواہ مخواہ روک ہی تو لے گا۔ ارے بھائی ہاں تمکین صاحب کدھر یار۔ ایک میوزک کلب نامپلی میں قائم ہوا ہے۔ ہر جمعرات کو اہل فن جمع ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے اب کی جمعرات کو تم بھی آ جاؤ اس کے ممبر بن جاؤ۔ خوب دلگی رہے گی۔ مولوی عبدالوہاب بھی آتے ہیں۔ ہمیشہ تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ بھئی وہ بھی خوب آدمی ہیں۔ گانے کا مذاق بھی اچھا ہے۔ یہاں بھوک سے جان نکل رہی ہے اور خواہ مخواہ ہیں کہ گانے میں محو ہیں۔ غرض ان لوگوں سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے

چاہے آپ کسی سے ملنے کیلئے وقت مقرر کر چکے ہوں اور پندرہ منٹ پہلے گھر سے نکل رہے ہوں۔ کپڑے پہنے ہوئے دیوانخانے کے دروازے میں ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی خواہ مخواہ گھیرے گا۔ ایں آپ کہیں جا رہے ہیں کیا واہ آپ آمدیتم برخاست یہ بھی کوئی بات ہے۔ طاقت مہمال نہ داشت خانہ بہ مہماں گذاشت، یار بیٹھو تو سہی اب تو تم ملتے ہی نہیں۔ پرسوں حمایت ساگر چلنے کا خیال ہے تم بھی چلو نا! دو تین دن رہ کر آ جائیں گے ہم نے ریکار کا انتظام کیا ہے۔ لاکھ کہیے کہ حضرت ہمیں کام ہے۔ ایک جگہ جانا ہے چائے کی دعوت ہے اور لوگ منتظر ہونگے مگر کون سنتا ہے انتہا یہ کہ وہ اتنی دیر تک بک بک کریں گے کہ آپ کا وقت گذر جائے گا اور لوگ آپ کا انتظار کر کے چائے پی لیں گے۔ دوسرے روز آپ کو جا کر معافی مانگنی پڑے گی آپ دنیا کے جھگڑوں سے اکتا کر تنہا وقت گزارنے کیلئے سنیما چلے جائیے۔ وہاں بھی کئی ایک ملاقاتی بیسیوں دوست ملجائیں گے سب سے پیچھا چھڑا اگر کسی کونے میں بیٹھ جائیے برابر والی سیٹ سے کوئی نہ کوئی ضرور مخاطب ہو جائے گا۔ افوہ بڑا لمبا کھیل ہے یا لارالی پلانٹ بھی غضب کی تی ہی۔ یا آپ نے بہت ہربلا خطہ کیا تھا، کہہ کر آپ سے کوئی نہ کوئی جواب سن لیگا اکیدفعہ آپ نے جواب دیا اور اس نے بے تکان سلسلۂ گفتگو جاری کر دیا پھر خیر ہنیں۔ یا تو سیٹ بدل ڈالئے یا درجہ بدل دیجئے۔ ورنہ ٹھنڈے

ٹھنڈے تشریف لیجائیے۔

یہ خواہ مخواہ بعض دفعہ آرام دِہ بھی ثابت ہوتے ہیں چنانچہ ہمیں بعض بعض خواہ مخواہوں سے بڑا آرام ملا اور فائدہ پہنچا ایک دفعہ سفر میں ایک خواہ مخواہ نے دو گھنٹہ تک مختلف سوال کر کرکے دماغ خراب کر دیا۔ مگر جب ہم منزل مقصود پر پہنچے تو انہوں نے نہ صرف ہمیں اس جگہ کے متعلق ضروری معلومات ہی بہم پہنچائے بلکہ پندرہ روز تک اپنے گھر پر مہمان رکھا۔ روزانہ ناٹک اور سینما دکھانے کے علاوہ اپنے نوجوان صاحبزادے کو ہماری رہبری کیلئے وقف کر دیا۔ چنانچہ اُن خواہ مخواہ اور اُن کے لڑکے کی وجہ ہم نے اس جگہ کے تمدنی اور معاشی حالات اس قدر معلوم کر لئے کہ اگر کسی دوسری جگہ دو سال بھی قیام کرتے تو اسکے عشر عشیر معلومات بھی حاصل نہ ہوتے وہیں ایک نوجوان ہندو خاتون نے خواہ مخواہ ہم کو ایک ہندو مدرسہ کا معائنہ کرانے کے علاوہ ۴-۵ مرتبہ چائے پر دعوت دیدی اور دل میں بین الاقوامی شادی کی ہوس بھی پیدا کر دی مگر خدا بھلا کرے ان خواہ مخواہ بزرگوار کا انہوں نے اپنے بعض تلخ تجربے سنا کر ہمیں باز رکھا۔ ورنہ معلوم نہیں ہمارے سر پر کتنے چرخے ٹوٹتے اور کتنی گاندھی ٹوپیاں خون میں تر بتر ہوتیں۔ ولے بخیر گذشت۔

•

ایک دفعہ کسی مذہبی معاملہ پر بحث کرتے ہوئے والد مرحوم نے ہمیں

خوب ڈانٹ ڈپٹ کی وہ نرے مولویانہ خیالات کے پکے سنّی المذہب بزرگ تھے اور ہم مذہب سے بہت دور مائل بہ دہریت اسلئے ان سی مذہبی حد تک ہمیشہ اختلاف رہتا تھا۔ تعلقہ ٹلجا پور پر وہ تحصیلدار تھے ہم بھی انکے ساتھ ہی تھے۔ ٹلجا پور میں تلجا بھوانی کا مشہور مندر ہے۔ وہاں دیول پر کروڑوں جاتریوں کا مجمع ہوتا تھا اور "کھنڈ اشنان" قابل دید تھا۔ چھوٹے سے حوض میں جس کا پانی متعفن ہو چکا تھا حسینان جہاں غوطے لگا کر آبرو بڑھاتی تھیں۔ ہمارا مشغلہ ہی یہ تھا کہ اشنان کا نظارہ کیا کرتے تھے ایکدفعہ ہم نے والد مرحوم کو بھی دعوت نظارہ دی۔ حضرت نے کھنڈ اشنان دیکھا اور خوب دیکھا۔ جاترا کے دن تھے۔ دور دور سے آئی ہوئیں غارت گرانِ صبر و ہوش و نازنینان تقویٰ شکن ہلکی سی ململ کی دھوتی سے حصہ اسفل و اعلیٰ کو چھپائے شرماتے لجاتے سکڑاتے ہوئے آ آکر اشنان کرتیں اور بھیگے ہوئے بالوں سے دُرِ خوش آب ٹپکاتے ہوئے ایک باریک سی اوڑھنی کو تمام جسم سے لپیٹ کر جب نکلتیں تو یہ معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ کوئی کپڑا جسم کو چھپائے ہوئے ہے یا نہیں۔ حضرت نے اس تماشے کو دیکھا اور خوب دیکھا۔ دن بھر اس پر کوئی رائے کا اظہار نہیں فرمایا رات کو کھانے پر آپ نے منجملہ اور برائیوں کے ہندوؤں کی یہ برائی بھی گنائی کہ اس بے حیائی اور بے باکی سے تقریباً برہنہ ہو کر اشنان کرتی ہیں اور خواہ مخواہ لوگوں کو

مائل بہ شہوت کرتی ہیں۔ ہم نے صرف قبلہ کے چھیڑنے کیلئے کہا پیرومرشد سنا ہے کہ جنّوں (چڑیلوں) کی حالت بھی تو یہی ہوتی ہے۔ ایک ہی کپڑا لپیٹے وہ بھی یوں ہی غارت کرتی پھرتی ہیں۔ بس غضب ہو گیا بڑے میاں نے کھانا چھوڑ کر گالیاں دینی شروع کیں اور رات کے بارہ بجے تک گالیاں سناتے رہے ہم نے اس ناگوار سلسلۂ گالی گلوج کو ختم کرنے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ چند روز کیلئے اِن کے سامنے سے ہٹ جائیں۔ چنانچہ دوسرے ہی روز شولاپور پہنچ گئے اور وہاں سے عادل شاہیوں کے اُجڑے ہوئے پایہ تخت بیجاپور جا ٹھہرے۔ ڈاک بنگلہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو شمالی ہند کے متوطن اور امبابائی (تلجا بھوانی) کے درشن کو آئے تھے اور درشن سے فارغ ہو کر بیجاپور دیکھنے آ گئے تھے چونکہ ان لوگوں نے ہم کو تلجا ماتا کے مندر میں بے تکلفی سے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا تھا اس لئے بیجاپور میں بلا کسی تعارف کے ہم سے گفتگو شروع کر دی اور خواہ مخواہ دوستی ہو گئی ایک خاتون نے جو آثارِ قدیمہ سے بھی کسی قدر دلچسپی رکھتی تھیں ایک چھوٹے بھائی اور ایک بوڑھی خادمہ کو ساتھ لیکر سفر کر رہی تھیں ہمیں اپنا گائڈ بنانے کی خواہش کی ہم نے بھی کمال ہمدردی اس سعادت کیلئے آمادگی ظاہر کی اور دوسرے روز سے تاریخی مقامات کا معائنہ شروع ہوا گول گنبد یا بولی گنبد سے لیکر جہتر محل اور ملک میدان توپ تک کا معائنہ

ہم نے کرا دیا۔ تصویریں لیں۔ اسٹال سے خریدی ہوئی گائڈ کے اندراجات کی غلطیاں نکالیں۔ اس کی صحت کی اور بیجا پور سے گلبرگہ کا رخ کیا اس زمانہ میں ہمارے وہ ایک عزیز گلبرگہ میں ضرور تھے مگر ہم لوگوں نے ڈاک بنگلہ ہی میں قیام کیا۔ اور دور دور تک قلعہ ہفت گنبد رکن الدین تولہ اور تالاب بھوسگا دیکھکر ہم لوگ حیدر آباد پہنچ گئے یہاں کی مصروفیتیں اتنی عجیب رہیں کہ

آپ سنئے گا تو شرمائیے گا

بہر حال اپنے ہم خواہ مخواہ بن کر دو ڈہائی مہینے ان کے ساتھ بسر کئے اور پھر انہیں گھر تک پہنچا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اب بھی دعا ہے کہ کوئی ایسا خواہ مخواہ مل جائے۔

ہمارے دفتر میں ایک صاحب بڑے خواہ مخواہ واقع ہوئے ہیں جہاں دو آدمیوں نے گفتگو شروع کی کہ آپ جا پہنچے اور دخل در معقولات شروع کیا۔ چاہے آپ اپنی گھر والیوں کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں یا کسی علمی ادبی مباحثے میں مصروف ہوں یا کسی چوقومی میچ پر خیال آرائی کر رہے ہوں۔ وہ برابر آپ کی گفتگو میں حصہ لیتے رہینگے۔ جدید خیالات کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ نئی دنیا سے وہ بالکل بے خبر ہیں پچپن سال عمر کو پہنچ چکے ہیں مگر "خواہ مخواہیت" کو کیا کریں گے۔ ہم نے ان کا نام

خُدائی فوجدار" رکھا ہے۔ وہ سنکر کبھی بگڑتے اور کبھی خوش ہوتے ہیں مگر "العادۃ طبیعۃ الثانیہ" کریں گے کیا مجبور ہیں۔

ہم نے بعض ایسے خواہ مخواہ بھی دیکھے ہیں جو غیور، خود دار، تنک مزاج سبھی کچھ ہوتے ہیں اور "اپنی خواہ مخواہیوں" کی وجہ سے بے طرح ذلت اٹھاتے ہیں۔ کئی کئی روز اسی کوفت میں رہتے ہیں مگر خواہ مخواہی نہیں چھوڑتے۔ ایک ہمارے دوست جو پولیس کے سرکل انسپکٹر ہیں ایکدفعہ اپنے مہتمم پولیس کے بنگلہ پر پہنچے۔ دورے سے واپس آئے تھے۔ مہتمم صاحب کا مزاج پوچھا۔ زنانہ سے ملازم لڑکا پان لایا۔ تو آپ نے اُسے روک کر فرمایا دیکھنا بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور مزاج پوچھنا مہتمم صاحب تھے قدیم وضع کے بزرگ، انہیں اتنا غصہ آیا کہ چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بگڑ کر فرمانے لگے۔ سرکل صاحب! آپ سے مجھ سے دفتری تعلقات ہیں۔ میری بیوی سے آپ کا کیا تعلق؟ آپ اسے سلام کہلوانے والے کون آئندہ ـــــ سے میرے مکان کی حد تک آپ ایسی حرکت نہ کیجئے ورنہ آپ کو نقصان ہوگا۔ غریب سرکل انسپکٹر کانپ اٹھا دو روز تک اسی کوفت میں رہا۔ مدت تک کسی کے گھر کی مزاج پرسی نہیں کی مگر آخر عادت تھی، چھوٹی تھوڑا ہی، آہستہ آہستہ پھر عافیت پوچھنے لگے۔

ان لوگوں سے بڑی تکلیف ہوتی ہے جو صورت دیکھتے ہی مخاطب

ہو جاتے ہیں اور خاندان بھر کے حالات پوچھنے کے علاوہ بعض ایسی خانگی چیزیں پوچھنے لگتے ہیں جو ظاہر نہیں کیجا سکتیں اور ایسے سوالات کر کے خود ہی پریشان ہوتے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی

تہذیب جدید نے اسکو بری نگاہوں سے دیکھا ہے تہذیب قدیم بھی اسے جائز نہیں رکھتی۔ مگر بوڑھوں کو کیا کیا جائے اُسے اچھا سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوست کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ بدقسمتی سے ان کے جد بزرگوار تشریف رکھتے تھے ہمارے دوست نے ان سے ہمارا تعارف کرادیا۔ بس غضب ہو گیا آپ کے والد کا نام کیا کرتے تھے آپ کے دادا کا نام، کس خاندان سے ہیں مکان کہاں ہے پیدا کہاں ہوئے تعلیم کہاں پائی نوکر کہاں ہیں۔ شادی ہو چکی۔ کب ہوئی کس شہر ہوئی۔ بچے ہیں کتنے ہیں۔ پیدا ہی نہیں ہوئے یا ہو کر جاتے رہے (مر گئے) ڈاکٹر راما نندجی کا پرچہ سوالات متعلق امراض مردمان و زناں تقریباً ایسے ہی سو سوا سو سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو بڑے میاں نے ہم سے فرمائے کہیے اسوقت ہم کیا کرتے۔ اگر صحیح صحیح جواب دیں تو سوالات میں اور وسعت پیدا ہو۔ اگر جواب نہ دیں تو بڑے میاں بگڑیں کہ کیا بد تہذیب ہے فقط

شادی سے پہلے

بچپن میں ہمیں شادی کی بڑی خواہش تھی اور یہ خواہش ہر چھوٹے لڑکے کو ہوتی ہے۔ کسی معصوم سے پوچھیے کہ "میاں شادی کروگے"؟ تو وہ جواب دیگا "کروں گا" "کس سے" تو کہدے گا "~~اماں~~ دادی سے" چلو چھٹی ہوئی۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے ہم نے کبھی ایسی خواہش تو نہیں کی البتہ ایک عزیز لڑکی جو رشتے میں ہماری بہن تھی اور ہم سے دو ایک سال بڑی بھی تھی ہمارے پیش نظر ضرور تھی۔ جہاں کسی نے پوچھا کہ میاں شادی کروگے تو ہم نے کہدیا کہ ہاں کریں گے۔ پوچھا کس سے تو کہدیا "بی بی" سے (یہ لڑکی کا نام تھا) بچپن کی آخری منزلیں طے ہونے تک ہم یہی چاہتے رہے کہ ہماری شادی بی بی سے کردی جائے، خیر جوانی کی ابتدائی سیڑھیاں ہم نے طے کرنی شروع کی تھیں کہ بی بی کی شادی ہوگئی ہمیں اس سے سخت رنج ہوا۔ دولہا کو ہم نے طرح طرح کی

اذیتیں دیں مختلف پہلوؤں سے ستایا۔ چنانچہ "چوتھی" کے روز ایسی خبر لی کہ دولہا میاں کا منہ کئی جگہ سے زخمی ہوگیا۔ خون بہنے لگا۔ وہ سمجھتے رہے کہ "سالا" مذاق کر رہا ہے اور ہم نے سوچا کہ بدلہ یوں ہی لینا چاہیئے خیر یہ دن بھی گذر گئے چند ہی مہینوں کے بعد ہم نے یہ واقعہ بھلا دیا والدین نے عزیزوں ہی میں ایک جگہ بات پکی کر لی تھی ہم نے تعلیم ختم کر کے ملازمت کر لی تو والدہ ماجدہ جنت کو سدھار چکی تھیں والد موجود تھے۔ اور صرف دو چھوٹے چھوٹے بھائی، والد نے اُن لوگوں سے جہاں بات (جو صرف منہ زبانی حد تک) ہوئی تھی گفتگو کی۔

لڑکی کے والد گزیٹڈ آفیسر تھے ایک معزز عہدے پر مامور اور خاصے متمول اور ذی رسوخ تھے، انہوں نے اپنی بیوی سے مشورہ کرنا شروع کیا کہ کیا کیا جائے حسب ذیل سوالات پیش نظر تھے۔

(۱) صرف پچھتر ماہوار ملتے ہیں۔

(۲) والد کی ماہوار منصب وغیرہ کافی ہے مگر کب تک؟

(۳) لڑکا غصیل، ضدی، ہٹ دھرم، پھکڑ، کاہل الوجود، عیش پسند، شوقین ہے اسلئے نہ تو آئندہ ترقی کرنے کی امید ہے اور نہ موجودہ آمدنی ہی اس کے اخراجات کو کفایت کرتی ہے!

(۴) لڑکے میں منجملہ اور چھوٹے چھوٹے نقائص کے ایک بڑا نقص یہ ہے کہ "سگریٹ کثرت سے پیتا ہے۔ ملحدانہ خیالات ہیں۔ نماز روزے کا پابند نہیں۔ بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ نہیں کرتا۔ کپڑے لتے جوتا ٹوپی پر تنخواہ صرف کر دیتا ہے۔ گانے کا شوق ہے اور ہمیشہ رنڈیوں کا گانا سنتا ہے ممکن ہے کہ پیتا کھاتا بھی ہو"

(۵) راتوں کو گھر سے غائب رہتا ہے، لوگوں سے لڑتا جھگڑتا، احباب کی صحبتوں میں زیادہ وقت گزارتا ہے!

لہذا

"لڑکی کو روپئے پیسے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی تکلیف ہوگی اور ان عادات کی وجہ سے لڑکی خوش نہیں رہ سکیگی،،

پس

کسیطرح اس گفتگو کو ختم کرنا چاہئے اگر صاف انکار کر دیں تو آپ میں کشیدگی اور شکر رنجی ہوگی عزیز داری میں ایسا ہونا اچھا نہیں۔ ابھی یہ لوگ غور ہی کر رہے تھے کہ ہمیں انکے خیالات کا علم ہو گیا اور ہم نے والد ماجد کو سارا قصہ سنا دیا اور یہ بھی عرض کیا کہ ہمیں اس جگہ شادی پسند نہیں براہ کرم آپ ان سے ملکر فرما دیجئے کہ لڑکا ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا اور شاید کوئی خاص لڑکی اس کے پیش نظر ہے اسلئے آپ اس فکر کو

دور فرما دیجئے اور لڑکی کی "نسبت" کسی اور جگہ کر دیجئے۔ والد قبلہ نے یہ دیکھکر کہ اگر میں ایسا نہ کہوں تو وہ لوگ صاف جواب دیدینگے جس سے خواہ مخواہ ملال ہوگا۔ اس لئے خود انھوں نے ہمارے مشورہ پر عمل کیا اور یہ جھگڑا اٹھا، اس سے ہمیں خاصی کوفت ہوئی اور ایسا ہونا فطری تھا کرتے کیا، صرف یہ کیا کہ شادی نکرنیکا عہد کر لیا، ڈیڑھ سال کے بعد والد نے ہمارے ننہالی عزیزوں میں سلسلہ جنبانی شروع کی خالہ اور خالو نے بھی انکا ساتھ دیا۔ بدقسمتی سے یہ لڑکی ہماری رشتے کی بہن تھی۔ ہمارے بغیر علم و اطلاع اُن حضرات نے گفتگو شروع کی۔ لڑکی کے والد انتقال کر چکے تھے۔ والدہ باقی تھیں جو تھیں ذری ہوشیار، جب ان لوگوں نے اُن سے شادی کے متعلق گفتگو کی تو وہ راضی ہو گئیں مگر اقراری جواب بھی دینا پسند نہیں کیا ادھر انہیں کہدیا کہ ذرا سوچ کر جواب دینگے اُدھر ہمیں کہلوا دیا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ تم شادی کیلئے آمادہ ہو یا نہیں ہم تو تلے بیٹھے تھے شادی نہ کرنے پر جلدی سے انہیں لکھ بھیجا کہ ہم شادی کرنا نہیں چاہتے البتہ کبھی دل چاہے تو کسی اچھی گانیوالی طوائف سے عقد شرعی کر لیں گے۔ اُن محترمہ نے ہمارے تیور دیکھکر والد سے کہدیا کہ لڑکی کے دادھیالی رشتہ دار مجبور کر رہے ہیں کہ اسکی شادی چچا کے لڑکے سے کیجائے اس لئے میں مجبور ہوں والد قبلہ بھی خاموش

ہو رہے مگر انہیں ایک مستقل خیال ہماری شادی کا پیدا ہو گیا۔ چھ سات مہینے کے بعد عزیزوں ہی میں ایک بزرگ سے گفتگو شروع کی جو مولوی عالم اور مولوی فاضل ہونیکے علاوہ نہایت مذہبی اور گزیٹیڈ عہدے پر فائز اور بھاری بھر کم (گراں ڈیل) تھے، یہاں بھی بلا استمزاجِ حقیر گفتگو شروع ہوئی اور بات پکی ہو گئی۔ ہمیں جب اطلاع ملی تو ہم نے والد کی ناراضی کے خیال سے خاموشی اختیار کرلی اور ڈیڑھ دو مہینے کے بعد آہستہ سے اُن بزرگ کے گھر مہمان ہو گئے، وہ اپنے مستقر پر تنہا تھے ہمیں دیکھکر بہت خوش ہوئے بڑی آؤ بھگت کی نہایت ہی خاطر داری فرمائی مگر ہم نے دن بھر ان کے ساتھ گزار کر رات کو انہیں خدا حافظ کہدیا اور وہیں ایک دوست کے مکان پر جاکر "مجلس سرود" منعقد کی دو تین رنڈیاں بلوالیں رات میں حضرت نے دیر تک انتظار کیا اور ہمیں ڈھونڈوایا تو پتہ چل گیا کہ ہم گانا سن رہے ہیں، آپ بہت ہی بھنائے ہم رات بھر کی جاگے ہوئے صبح پہونچکر سو رہے حضرت نے دن بھر گفتگو نہیں کی، دوسری رات بھی ہم نے ایسی ہی بسر کی اور صبح آکر نہائے ناشتہ کیا اور اپنا سوٹ کیس کھولکر کپڑے وغیرہ نکال کر اِدھر اُدھر رکھے دو شیشے ایک "بیر" کا اور ایک "وہسکی" کا ہم نے سوٹ کیس میں رکھ چھوڑے تھے۔ ان دونوں کو بھی باہر پھینک دیا۔ اور پڑکر

سو رہے نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا خود انہوں نے دیکھا مگر انہیں
ان دونوں شیشوں کا علم ہوگیا اور ان کے غصے کی انتہا نہیں رہی۔
اسی وقت والد کو تفصیلی خط لکھا جس میں ہماری بڑی تعریف کی تھی
اور یہ بھی کہ آپ کسی اور جگہ انتظام کیجیئے میں ایسے آوارہ لڑکے کو
اپنی لڑکی نہیں دونگا۔

جب ہمیں یقین ہوگیا کہ بزرگوار کو ہماری ان حرکات سے
کمال خوشنودی حاصل ہوئی ہے تو ہم نے دوسرے ہی روز کوچ بول
دیا، وہ شیشے ہم نے سیٹرم اسٹیشن سے آگے بڑھتے ہی پھینک دیئے
اور نہایت متانت سے مستقر پہنچ کر اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے
والد قبلہ نے کئی روز تک گفتگو نہیں کی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ
ہم نے محض اپنے آپ کو شرابی ظاہر کرنے کیلئے دو شیشے بھی ساتھ رکھکر
ان بزرگ کے گھر پر قیام کیا تھا تو خوب بگڑے مگر کرتے کیا خاموش
ہو رہے اور ہمیشہ کیلئے ہماری شادی کے مسئلہ کو ختم کر دیا۔ چنانچہ
مرنے تک ہماری شادی کی کوشش نہیں کی البتہ انتقال سے چند روز
پہلے نہایت ہی محبت سے ہمیں بلا کر کہا کہ "بیٹا شادی کر لو یہ میری
آخری خواہش ہے کہ تمہیں دولہا بنا دیکھوں۔ اسکے بعد اطمینان سے
مرجاؤں گا۔ ہمنے بکمال سعادت مندی فوراً آمادگی ظاہر کی اور

یہ کہا کہ آپکے صحت یاب ہوتے ہی شادی کی فکر کریں گے مگر اجل نے انہیں مہلت نہیں دی اور ہماری شادی کا ارمان دل ہی دل میں لیٔے جاں بحق ہوئے۔ والدِ مرحوم کے وصال کے بعد ہمنے "بین الاقوامی شادی" کی ٹھان لی ان دنوں "انٹرنیشنل میرتج" کا خوب چرچا تھا چند مہینے پونے کی سٹرکیں ناپیں۔ مرامٹہ تعلیم یافتہ خواتین سے راہ و رسم پیدا کئے مگر دو ڈھائی مہینے کے بعد ہی یہ جنون جاتا رہا اور ہمیں کچھ خیال انگلو انڈین سے عقدِ شرعی کرنیکا پیدا ہوا بعض تو عیسائی شدہ احباب سے اس کا اظہار کیا تو انہوں نے اس خیال سے باز رکھا اور ہم کورے کے کورے رہ گئے۔

چونکہ ہمنے ایک شاعر کے گھر میں جنم لیا تھا اور ہمارے دادا پڑ دادا بھی شاعر تھے اسلئے شاعری ہمیں ترکے میں ملی تھی جس کے ساتھ عاشق مزاجی بھی آ گئی۔ چنانچہ ہماری عاشق مزاجی میں فرق نہیں آنے پایا، بدنصیبی کہیے یا خوش نصیبی کہ انہیں دنوں میں ایک جگہ دل بستگی ہو گئی مگر چند ہی روز کے بعد افتراق پیدا ہو گیا اور ایک طوطا چشم نے بکمال بے مروتی آنکھیں پھیر لیں۔ اسوقت ہمیں معلوم ہوا کہ عورت کسقدر خود غرض، لالچی اور غیر وفا شعار ہوتی ہے اس کے بعد ہم نے حتمی ارادہ کر لیا کہ نہ تو کسی چونڈے والی سے دل لگائیں گے اور نہ ہی شادی۔

کریں گے۔ اسوقت ہمیں "پنچ متر" کا یہ مقولہ یاد آتا تھا کہ
"عورت ایک سے بات کرتی ہے تو دوسرے کی طرف اضطراب کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دھیاں اس کا تیسرے کی طرف ہوتا ہے"
"ہتوا اُپدیش" کے اس خیال سے بھی ہمیں کامل اتفاق تھا کہ
"عورت ہمیشہ بیوفا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ لوگ کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کی استریوں (عورتوں) کا بھی یہی حال ہے اگر کوئی عورت پاک دامن ہے تو اُسکی وجہ یہ نہیں کہ وہ عفت مآب ہے بلکہ صرف یہی کہ اس سے کوئی کسی عنایت کا طلبگار نہیں ہوا" تلسی داس کا یہ قول ہمیں یاد آتا تھا کہ
"عورت کے چرتروں کا سمندر ایسا گہرا ہے کہ اسکی تہہ نہیں ملتی"
عورت کے خلاف جتنے مقولے تھے ہم نے سب "منہ زبانی" یاد کرلئے تھے اور ہمیشہ ان کا ورد ہوتا رہتا تھا۔ مگر کب تک زمین نے اپنے محور کے گرد صرف تین گردشیں کی تھیں کہ پھر کسی کے گیسوئے مشکیں نے پھانس لیا اور ع۔

بڑا بول آگے آیا ہم جو بولے تھے لڑکپن میں

اسوقت ہم نے محسوس کرنا شروع کیا کہ عورت "تاج آفرینش" ہے بہترین اور آخرین تحفہ آسمانی ہے" زمین کی فرشتہ خدا کی ذات کی دلرُباترین

اور یکتا ترین پرتو ہے" ایک ایسی مخلوق ہی جسمیں لطیف ترین اور صمیم ترین جذبات ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس کا وجود تقدیس اور تعظیم کیلئے ہے۔ بہر حال اس دلربائی کے راز سربستہ کو جس کا دروازہ مقفل ہے ہمنے بہت کچھ سمجھ لیا تھا مگر قسمت ــــ موت نے ایک دائمی پردہ حائل کر دیا اور ہم رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ چار چھ مہینے سوگ منایا۔ اور نہایت خاموش زندگی بسر کرنی شروع کی چند دنوں عورت کا خیال تک دل میں نہ آتا تھا مرحومہ کے بعد کوئی ہستی ہی عورت کی پیش نظر نہ تھی۔ مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی جاتی رہی، زندگی میں ایک خلا محسوس ہونے لگا ایک کمی نظر آنے لگی اور ایک چیز ایسی خیال میں آتی تھی جو موجود نہ تھی، یہ تھی دماغی حالت مگر ضروریات زندگی نے بھی اس کی تائید شروع کی، بچپن سے ہم تنہا رہنے کے عادی تھے صرف دو کمرے ہمارے لئے کافی ہوتے تھے ایک کمرے میں بیٹھتے اٹھتے پڑھتے لکھتے اور دوسرے کمرے میں سوتے تھے اور اسی کمرے میں سارا سامان رکھا تھا۔ جب تک ہم یونہی زندگی بسر کرتے رہے مگر بے انتہا تکلیف ہونے لگی۔ دو دو دن کمرا نہیں جھاڑا جاتا تھا۔ کتابوں پر گرد جمی رہتی تھی۔ جوتے کوئی بھی صاف نہیں کرتا تھا۔ کپڑے بڑی بے احتیاطی سے بڑے خراب ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی تکلیف الگ تھی۔ دوست احباب عزیز واقارب سبھوں کا یہی مشورہ۔

ہوتا کہ شادی کر لو۔ آخر ہم نے تھک کر اپنی برادری کا جائزہ لیا اور "قرعۂ فال" ان محترمہ کے نام نکلا جو اب ہمارے پلّے منڈھی ہوئی ہیں۔

ہم نے خانہ بردوش زندگی اور روز روز کی کوفت سے تنگ آکر ایک روز اپنی خالہ صاحبہ (جو اب خوشدامن ہیں) سے جا کر بکمال سعادت مندی کہا کہ ہمیں اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے۔ پہلے تو انہوں نے اُسے دل لگی ہی خیال کیا مگر جب ہم دیر تک یہی الاپتے رہے تو کہا میاں! کسی اور سے کہلوایا ہوتا۔ آخر اتنے عزیز و اقارب ہیں خالہ۔ خالو۔ چچا چچی کسی کو بھی کہتے وہ آکر مانگتے۔ بھلا یہ کیا طریقہ ہے۔ ہم نے کہا جی حضور شادی کریں گے ہم، آپ بیٹی دینگی ہمیں پھر یہ تیسرے آدمیوں کا توسط کیوں؟ خیر بڑی ردّ و قدح کے بعد یہ طے ہوا کہ ہماری خالہ جان (جو ہماری خوشدامن صاحبہ کی خالہ زاد بہن اور ہماری حقیقی خالہ تھیں) گفتگو کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بات ٹھہر گئی۔ لگیں رسم کی تیاریاں ہونے دو تین وقت منگنی کی تاریخیں مقرر ہو کر بدل گئیں بالآخر منگنی کی رسم ادا ہوئی اور باضابطہ معاملہ طے پا گیا۔

منگنی کے بعد سے ہماری محترمہ ہونے والی بیگم صاحبہ کے مزاج ہی بدل گئے۔ جس دن سے گفتگو ہوئی تھی اُس دن سے وہ ہم سے پردہ کرنے لگیں تھیں منگنی کے بعد سے تو اور "گاڑھا پردہ" ہونے لگا جب بھی

ہم گھر کو جاتے وہ کسی کمرے میں جا بیٹھتیں اور اندر سے قفل پڑ جاتا۔ جب تک ہم رہتے قفل نہیں کھلتا، یہ پردہ صرف ہمیں سے نہیں، ہمارے بھائیوں اور عزیزوں سے لیکر ہماری ماماؤں سے تک ہوتا۔ خدا رکھے ہماری بڑی سالی کو بیچاری بڑی سمجھ دار لڑکی ہے۔ اس نے لاکھ سمجھایا منایا، کہ ان خرافات کو چھوڑے مگر "بیوی راضی نہوئیں" نہ صرف انہوں نے پردہ کرنیکی ٹھان لی بلکہ بعض ایسی حرکات بھی سرزد ہونے لگیں جن پر دیوانگی کا شبہ ہوتا تھا۔ خاندان میں چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں تھیں، جن بچوں کو ہم کبھی پیار کیا کرتے تھے اُن کو یہ پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتی تھیں اس لئے کہ ہم پیار کرتے ہیں، دیکھئے کس قدر شدید رقابت تھی۔

انہیں معلوم ہوتا کہ ہم دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں تو کمرے میں گھس کر اندر سے بند کر لیتیں، اگر کوئی ہمارا نام لیتا تو اس سے گفتگو کرنا چھوڑ دیتیں ہم کوئی کتاب بھولتے تو اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتیں۔ کسی دن ہم ان کے گھر پر کھالیتے یا چائے پی لیتے تو وہ اس روز چائے پیتیں نہ کھانا کھاتیں۔

ایک روز انکی بھاوج نے (جو ہماری بھی بھاوج ہیں) ایک رسالہ جسمیں ہمارا ایک ظریفانہ مضمون تھا ورق الٹ کر اور مضمون کی سرخی بتلا کر دیدیا کہ اسے پڑھو بڑا عجیب مضمون ہے۔ بیگم صاحبہ نے مضمون پڑھنا

شروع کیا بہ آواز بلند پڑھکر سبھوں کو لگیں سنانے دو تین ورق پڑھ ڈالے چوتھا ورق جو الٹا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہمارا نام نظر آیا بس سالہ پھیپک لگیں رونے اور روتے ہوئے کمرے میں جا کر بیٹھ رہیں اور رات کا کھانا تک نہیں کھایا۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ ہم کو شادی کی آرزو تھی اور اس سے بڑی بڑی توقعات تھیں خصوصاً جب کبھی ہم بیمار ہوتے، شادی نہ کرنے پر افسوس ہوتا۔ جب کبھی وقت پر اچھا کھانا نہ ملتا تو ہم اسے جورو کی غیر موجودگی کا سبب سمجھتے، جب کبھی تھکے ماندے گھر آتے اور کتاب دیکھنے کو دل چاہتا نہ مضمون لکھا جاتا تو ہم آرام کرسی پر لیٹ کر اپنے آپ پر نفرین کرنے لگتے کہ کیوں شادی نہیں کی۔ جب کبھی سکندر آباد جاتے اور واپسی پر حسین ساگر کے کٹے (بند) پر مخالف ہوا ہماری سائیکل کو روکنے لگتی تو اپنی اس حماقت پر بڑی کوفت ہوتی کہ ہم نے کیوں شادی نہیں کی ورنہ جہیز میں کم از کم موٹر سائیکل ضرور ملجاتی جب کبھی کسی شریف آدمی کو اپنی بیوی کو ساتھ لیے سینما آتے یا جاتے دیکھتے تب بے انتہا کوفت ہوتی کہ کیوں ہم ایسے نہ ہوئے بدنصیبی سے بعض ایسی خواتین سے، جو ہم سے خلاف کنایت تھی جو ہمیں صرف "مولانا" سمجھے ہوئے تھیں اور کوئی

بڑا ہی سن رسیدہ مجمع معتمم، ریشا ئیل، مدرسہ نظامیہ یا دیوبند، یا سہارنپور کا فارغ التحصیل خیال کرتی تھیں، وہ جب کبھی خط لکھتیں تو "بیگم تمکین" کو آداب فرمائیے تسلیمات فرمائیے، مزاج پوچھیے خیریت لکھئیے ضرور لکھتیں، ہم بکمال دروغ بافی یا دروغ گوئی یا دروغ نویسی، بہ اطمینان تمام لکھ دیتے کہ سلام کہتی ہیں۔ آداب عرض کرتی ہیں، عافیت پرسی کی رہین منت ہیں۔ مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہیں مگر واقعہ یہ تھا کہ بیگم صاحبہ تھیں ہی نہیں۔ اکثر دوست احباب جو ذرا کم ملنے والے تھے یہی سمجھتے تھے کہ ہم شادی شدہ ہیں ہماری عافیت کے ساتھ بیگم صاحبہ کی خیریت بھی پوچھ بیٹھتے اور ہم بکمال تیزی یا صفائی کہہ دیتے کہ اچھی ہیں۔ ایک رسالہ کی مدیرہ نے بڑی متانت سے بیگم تمکین کے نام پہلے تو رسالہ روانہ فرمانا شروع کیا دو چار پرچے بھیج کر آپ نے ایک خط لکھا کہ "محترمہ مضمون روانہ فرمائیے" ہم نے بھی ایک عدد مضمون اپنی فرضی محترمہ کے نام سے بھیج دیا اور مدت تک بھیجتے رہے۔ نظام ساگر کنال پر ایک مہاراج جو سررشتہ تعمیرات میں ملازم اور لاہور کے باشندے تھے تشریف رکھتے تھے اسی رسالے میں آپ نے بھی فرضی عورت کے نام سے مضمون نگاری شروع کی، اور اسی سلسلہ میں بیگم تمکین سے خط و کتابت شروع ہوگی

ایک ہندو دیوی کے خطوط محترمہ کے نام بڑے ہی محبت بھرے وصول ہونے لگے ہم پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے کہ کیا معاملہ ہے بعد میں جو دریافت کیا تو پتہ چلا کہ راجہ جی یہ یک بینی و دوگوش تن تنہا واقع ہوئے ہیں اور فرضی نام سے مضمون لکھتے اور خط وکتابت کرتے ہیں چنانچہ ہم نے ایک دفعہ بیگم صاحبہ بن کر لکھ مارا کہ "بہن میں اپنے شوہر کے ہمراہ نظام ساگر دیکھنے آرہی ہوں اور آپ کی مہماں ہوں گی آپ میری رہائش کا انتظام کرسکیں گی یا کیا؟

مہاراج نے خط لیکر پڑھا اور پھر پھٹے ہوئے لفافے کو جوڑ کر پوسٹ مین سے اس پر یہ لکھوا کر کہ "مکتوب الیہ نہیں ہیں" واپس کرادیا اور اس دن سے آجتک کبھی بیگم تمکین کو خط نہیں لکھا ہم نے جب اس واقعہ کو شہرت دی اور ان کے آفیسرز کو یہ راز معلوم ہوگیا اور ایک بزرگ ان کے سخت مخالف ہو گئے تو انہوں نے کوشش کرکے آرایش ملدہ میں منتقلی کرالی نہ جانے اب کہاں ہیں۔ ایک دفعہ ہم سفر کررہے تھے واڑی خنکشن پر "زنانہ سیکنڈ کلاس" کے ڈبے میں ایک کھورے کھورے بالوں والا، پھولے پھولے گالوں والا، بھرے بھرے جسم کا چھوٹا سا لڑکا نظر آیا ہم نے کھڑکی کے پاس پہونچکر اسے بلایا تو آگیا، گود میں اٹھا کر لگے پلیٹ فارم پر ٹہلنے، چونکہ بچہ اچھا

لے جانے کے ایڈیشن نمبر ۱۱ میں دیوی صاحبہ کی تصویر بھی شائع ہوئی ہے

اور صحت مند تھا اس لئے ہر شخص اسے دیکھتا اور پوچھتا "کیا آپکے صاحبزادے ہیں؟" اور ہم ذرا شرما کر ہنس دیتے ہم نے تو جواب جاہلاں سمجھ کر خاموشی اختیار کی تھی مگر ان جاہلوں نے نیم رضامندی یا "اعترافِ پدریت" سمجھکر اس پرائے بچے کو ہمارا قرار دے لیا پھر کیا تھا جو شخص بھی ملتا کہتا "اچھا آپ معہ زنانہ سفر کر رہے ہیں؟" کوئی کہتا "اماں امدت کے بعد تم زنانہ مستقر پر لئے جا رہے ہو۔ اچھا بھئی حیدرآباد کی آب و ہوا خراب بھی تو ہے؟" کوئی کہتا "بھائی گرمی کے دنوں میں زنانہ کیوں لے جا رہے ہو گلبرگہ میں شدید گرمی ہوتی ہے گرمی کے بعد لیجاتے؟" جتنے منہ اتنی باتیں ہم سنتے اور خاموش رہجاتے ایک کرم فرمانے جو "ہنواں" کے رہنے والے تھے بچے کو دیکھا تو زنانے کے ساتھ ہونے کا یقین کرتے ہوئے کہا "یار پان کھلوادو" ہم نے جیب سے ڈبیہ نکال کر تواضع کرنی چاہی مگر وہ اڑے رہے کہ نہیں "بھاوج کے ہاتھ کا لگا ہوا تازہ پان ہو!" ہمیں بھی شرارت سوجھی دوڑ کر تھوڑا سا میوہ خریدا پیپرمنٹ اور مٹھائی بھی لی اور بچہ کو ریل کے ڈبے میں پہونچا کر پیار کرتے ہوئے کہا میاں دو پان تو بنوا دو، اندر سے تھوڑی دیر کے بعد ایک کالی کلوٹی آیا نے ایک نہایت نفیس چاندی کی نقشی ڈبیا بڑھادی جس میں چار پان دو

کتھے اور دو چونے کے الگ الگ لگے ہوئے تھے ہمارے مہربان
بہت بگڑے کہ یار سو کھے کتھے کے پان کون کھائے۔ ہم نے کہا بھیّا!
تمہاری بھاوج ٹھیٹھ دکنی ہیں وہ پان میں پکا ہوا کتھا نہیں کھاتیں
پھر تمہیں کہاں سے لادیں چونکہ پان پکّے اور خوبصورت بیڑے
بنے ہوئے تھے اس واسطے حضرت کھا گئے ہم نے کہا چلو رسیدہ بود
بلائے ولے بخیر گذشت۔ اسی طرح اکثر احباب کو ہمارے شادی شدہ
ہونے کا یقین تھا۔ مگر جب کبھی وہ لوگ اپنے ایقان کا اظہار کرتے ہمیں
سخت تکلیف ہوتی اور نہایت حسرت سے دل ہی دل میں کہتے کہ کاش
ایسا ہوتا۔

اسی کوفت کو مٹانے کیلئے ہم نے شادی کی ٹھان لی اور منگنی
بھی ہوگئی مگر واقعات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ شادی بڑھنے
لگی کبھی ربیع الاوّل میں کبھی ذالحجہ میں بہرحال ایک مدت تک یہی

حرف خطاب جیسے رشید کا تی ہیں تو ہے
شلغم الدولہ حضرت برقی نے لکھا ہے

———— ٭ ————

خان صاحب

لوگ کسی خبیث بوڑھے کو دیکھتے ہیں کہ "اسے زرق ہے نہ موت" بالکل یہی حال ہمارے خانصاحب کا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کمر جھک گئی ہے پیٹ اکڑ گئی ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہے بال پک گئے ہیں چہرے پر جھریاں آگئی ہیں۔ گال پچک گئے ہیں۔ دانت گرے مدت ہوئی دو چار جوڑے (مصنوعی دانت) بدل چکے ہیں، مگر ہیں بزعم خود جوان دو شادیاں کیں اور دو ہی نکاح کئے۔ ان چاروں نیک بختوں کو قبرستان پہونچا دیا۔ عزیز، قرابت دار، خویش و اقارب کوئی باقی نہیں رہا اپنے خاندان میں فقط آپ ہی آپ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہو کر رہ گئے چنانچہ اسی لئے یہ مصرعہ ہمیشہ تلاوت فرمایا کرتے ہیں۔ ع

"ایک میں ہوں یا خدا کی ذات ہے"

مشہور ہے کہ خانصاحب نے مدتوں شاعری کی خصوصاً ایک واقعہ

بہت مشہور ہے یہ کہ ایک دفعہ خانصاحب نواب جعفر بہادر کے پاس پہنچے۔ نواب صاحب آپکی بہت قدر کرتے تھے۔ دس بجے سے بارہ بجے تک بیٹھے رہے۔ بارہ بجے نواب صاحب کا خاصا چنا گیا محل سے چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ حضور خاصہ تیار ہے نواب صاحب نے خانصاحب کو رخصت فرمایا خود محل کیطرف تشریف لے چلے ابھی زنانی دروازے تک پہونچے بھی نہ تھے کہ خانصاحب نے بڑھ کر عرض کیا حضور سے کچھ عرض کرنا تھا۔ نواب صاحب ٹھہر گئے فرمایا کہو عرض کیا حضور تشریف رکھیں تو عرض کروں نواب صاحب پھر واپس ہوئے آکر اپنی جگہ بیٹھ گئے خانصاحب نے عرض کیا حضور خانہ زادِ موروثی نے ایک شعر عرض کیا ہے بالکل نئی بندش، نیا مضمون اور نئی زمین ہے، نواب صاحب کا اشتیاق اور بڑھا فرمایا سناؤ پھر تو خانصاحب نے تعریف کے پل باندھ دیئے کہنا شروع کیا "خداوند یہ جو دہلی کے داغ صاحب ہیں اور یہ جو امیر مینائی مشہور ہیں۔ بھلا شعر کیا جانیں۔ علوی اور ملکیش کو شاعری سے تعلق کیا ہے۔ شعر کہنا تو کچھ خانہ زادوں ہی کا کام ہے۔ ملاحظہ ہو کیا شعر عرض کیا ہے۔ ابھی خانصاحب کی بکواس جاری ہی تھی کہ اندر سے ایک ماما نے آکر عرض کیا کہ سرکار خاصہ تیار ہے مگر نواب صاحب

ہوں کہکر پھر خانصاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور خانصاحب نے پھر وہی تعریف شروع کی ایک بج گیا۔ مگر تعریف ختم نہیں ہوتی ڈیڑھ بجے نواب صاحب نے شدت اشتہا سے بیچین ہو کر فرمایا اجی خانصاحب شعر سنا دیجئے مجھے اندر جانا ہے۔ بس پھر کیا تھا خانصاحب دو زانو ہو کر بیٹھ گئے عباسی کو بازو سے لیکر سامنے رکھ لیا دستار سیدھی کی کمر کا بگلوس برابر کیا۔ انگرکھے کی جھریاں درست کیں اور کھنکار کر حلق صاف کیا تنتے ہوئے مسکرا کر کہا حضور ایسا شعر کوئی کہہ لے تو میں جانوں میرا دعوےٰ ہے کہ داغ، امیر، میر، علوی، بیکش، سے لیکر برق، زار، ناظم، کیفی، تجلّی، ہست، رسوا، حبیب، ضیغم، کوئی تو ایسا ایک مصرعہ کہہ لے۔ اسی گفتگو میں دو بج گئے اور مارے بھوک کے نواب صاحب کا بُرا حال ہو گیا۔ نواب صاحب نے بیچین ہو کر فرمایا اجی خانصاحب شعر ایسا ہی ہو گا مگر سنائیے تو، پھر خانصاحب نے گلا صاف کیا اور گنگنا کر حافظہ پر بار ڈالا مگر کچھ نہیں ادھر نواب صاحب متقاضی کہ جلد شعر سنائیے ادھر خانصاحب متلاشی کے شعر یاد آ جائے۔ انتہا یہ کہ ڈھائی بج گئے اور خانصاحب کو شعر یاد نہ آیا۔ مجبوراً عرض کیا حضور اسوقت حافظہ سے اتر گیا ہے۔ کل انشاءاللہ عرض کروں گا نواب صاحب کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا، مگر خاموش ہو رہے۔

مسکراتے ہوئے محل میں تشریف لے گئے۔

خانصاحب کا دیوان بھی مشہور ہے ایک بزرگ فرماتے تھے کہ خانصاحب نے ایک دفعہ ایک بڑے شاعر کو گانٹھا اور گھر لیجا کر لگے گپ کرنے انہوں نے شعر سنانے کی فرمائش کی تو آپنے اندر سے ایک قلمدان منگوایا اسے کھولکر ایک چھینٹ کا بستہ نکالا جسے کھولا تو ایک بھرے کا جزدان نکلا اسمیں سے ایک مخمل کا جزودان برآمد ہوا اور مخمل کے جزدان میں سے ایک باریک ریشم کا جزودان نکالا گیا جس میں ایک چھوٹی سی بیاض مطلا مذہب جلد کی نکلی خانصاحب نے پہلے تو بہت کچھ انکسار فرمایا اور پھر شعر سنایا۔

جو سڑک جاتی ہے مدینے کو

سننے والا منتظر کہ دوسرا مصرعہ بھی سن لے تو داد دے اور خانصاحب بیچین کہ داد مل جائے تو دوسرا شعر سناؤں آخر مہمان نے اکتا کر کہا خانصاحب مصرع ثانی ارشاد ہو۔ بس خانصاحب کے آگ لگ گئی فرمانے لگے یار تمہیں شاعر کس مردود نے بنا ڈالا تم تو حجام ہو میں پورا شعر سنا رہا ہوں اور آپ مصرع ثانی کی فرمائش کرتے ہیں جنگلی کہینگے! غصہ میں آکر اپنی بیاض کو پھر جزدان در جزودان کرکے قلمدان میں رکھدیا اور خود دیوانخانے سے

چلے گئے۔ سنا ہے کہ پھر کبھی اُن صاحب سے ملاقات نہیں کی اور نہ انکو شاعر کہا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ وہ تو ہیجگلی ہے جنگلی۔

مشہور ہے کہ خانصاحب جوانی میں بہت تنتے پھرتے تھے۔ روزانہ پانچ بجے ہتیار لگاکر بانکے جواں بن کر گھوڑے پر سوار ہوکر چارمینار کا ایک چکر ضرور کاٹتے، ایکدفعہ خانصاحب شربتی ململ کا انگرکھا اونچی چولی والا پہنے ناندیڑی کلی کا سیلا باندھے کمر میں کٹار لگائے ڈاب میں عباسی ڈالے ایک مشکی گھوڑے پر سوار گھوڑا اڑاتے ہوئے چارمینار کے پاس پہنچے اس زمانے میں چارمینار کے اطراف کے بنگلوں (کوٹھوں) میں رنڈیاں تھیں، ایک بی جان کھڑی ہوئی سڑک کا نظارہ کر رہی تھیں کہ خانصاحب کا گھوڑا انکے کوٹھے کے نیچے پہنچا بی جان نے جھک کر بندگی کی خانصاحب نے سلام لینے کیلئے ہاتھ اٹھایا تو لگام ڈھیلی ہوئی اور گھوڑے نے ٹھوکر لی خانصاحب نے باگیں کھینچ کر گھوڑے کو رانوں میں مسلا اور کوڑا کیا اس گڑبڑ میں گھوڑے سے ریح صادر ہوگئی۔ آواز سنکر بی جان لگیں مسکرانے خانصاحب نے مونچھیں چڑھاتے ہوئے فرمایا "مردانِ عالم جس پر سواری کرتے ہیں اُسے پدا دیتے ہیں" بی جان نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور گھروالی پدمن ہوگئی ہوگی" شہر کے بیکار دل کا تو یہ اڈا ہی تھا

سینکڑوں بانکے نوجوان کوٹھوں کے نیچے کھڑے تھے۔ انہوں نے
یہ فقرہ سنا تو لوٹ گئے وہ وہ پھبتیاں اڑائیں کہ خانصاحب بوکھلا گئے
اور گھوڑا الٹا کر گھر کا رخ کیا اسدن سے آجتک پھر چار مینار کیطرف نہیں گئے
منصب کے علاوہ خانصاحب کی جاگیر بھی تھی اور دو ایک
چھوٹے چھوٹے مقطع (موضع) بھی تھے تنہائی سے اکتا کر خانصاحب نے
شادی کی فکر کی تو بعض حریصوں نے یہ سمجھ کر کہ بوڑھا آجکل میں مرنے
والا ہے اپنی نوجوان لڑکیوں کو دولت کی بھینٹ چڑھانا چاہا چنانچہ
ایک نوجوان لڑکی سے خانصاحب کی شادی نہایت دھوم دھام
سے ہوئی اس تقریب میں لوگوں نے سہرے، قصیدے، قطعات اور
رباعیات اتنے لکھے کہ اگر ان کا مجموعہ شائع کیا جائے تو ایک خاصی
کتاب یا شادی نمبر ہو جائیگا۔ چنانچہ ایک صاحب نے ایک قطعہ
لکھتے ہوئے یہ مصرعہ بھی لکھدیا۔ ع۔

۱۴۰ صد و سی سال کا نر، پانچ برس کی مادہ

خانصاحب کی دوسری جمعگی کے روز ایک صاحب نے ایک طویل
نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

ستم ہے ایسی نوجوہ پر تاسف ایسے شوہر پر
یہ آمادہ ہے مدت سے تو وہ بیکار بیٹھے ہیں

بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں مگر واقعہ یہ ہے کہ شادی کے

پہلے خانصاحب نے مراد آباد کی مردہ زندہ کرنیوالی دوا سے لیکر دوائے شاہ جہانی اور واجد علیشاہی تک منگوا لیا تھا اور آنتک نگرہ گولیوں سے لیکر حکیم اجمل خانصاحب کے دواخانہ یونانی دہلی سے کشتۂ فولاد تک طلب کر لیا شہر کے سارے طبیبوں، عطائیوں، اناڑیوں، ڈاکٹروں حکیموں ویدوں سبھی سے نسخے لکھائے مغز سر کنجشک خانگی، کا حلوا تیار ہوا اور نسخۂ شاہجہانی کے طریقے پر "حلوۂ گذر" بنایا گیا "سانڈے کا تیل اور اجمل خانصاحب کی تکمید، تدبیر اعلیٰ سبھی چیزیں استعمال کی گئیں مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کا مصداق رہا خانصاحب پر کوئی بھی اثر نہ ہوا مشہور ہے کہ جلوے کی رات خانصاحب نے بڑی بے اطمینانی سے بسر کی اور فجر کی نماز بھی ادا کی جس کے لئے صرف وضو کرنے کی ضرورت پڑی غسل واجب ہی نہیں ہوا اس واقعہ کو سنکر ایک صاحب نے

شب زفاف و نماز سحر یہ خوب کہی

ایک غزل کی غزل کہدی.

بیچاری دلہن اپنے جذبات کو روکتی رہی مگر کب تک آخر دق کا شکار ہوگئی۔ ایک سرخ و سفید رنگت والی۔ پھولے پھولے گالوں والی

کالے کالے بالوں والی بھرے بھرے بدن والی سیزدہ سالہ نوجوان لڑکی کھل کھل کر جو بھی چالوں ہی میں آدھی رہ گئی پانچویں چمعگی سے جو فرائش ہوئی تو بس ہی بارہ مہینے میں ختم ہو گئی۔

مشہور ہے کہ خانصاحب نے شادی تو کرلی مگر انکی جان ضیق میں پڑ گئی تھی۔ رات یونہی انہیں نیند نہ آتی اگر وہ سو بھی جاتے تو دلہن جگا دیتی اس سے نجات پانے کے لئے خانصاحب نے بجائے علیحدہ پلنگڑیاں (چارپائیاں) ڈلوا دی تھیں اور ایک کمال یہ کرتے کہ دن بھر ہنسی خوشی رہتے مگر مغرب ہوتے ہی منہ پھلا لیتے اور رات کا کھانا کھاتے وقت کوئی نہ کوئی چھیڑ نکال کر بگڑ جاتے اور غصہ غصہ میں منہ لپیٹ کر پڑ رہتے اگر اس کے باوجود بھی وہ غریب کسی نہ کسی طرح انہیں جگا دیتی تو کراہنے لگتے کبھی ڈاڑھ میں درد بتلا کر اسے پانی گرم کرانے کیلئے کہتے اور کبھی سر میں درد ظاہر کر کے اس غریب سے صندل گھسواتے آخر بیچاری کو مار کر دم لیا۔ فقط